ارمغان حجاز

مصنفہ — مترجم

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ — عبدالرحمن طارق

سال طباعت — سنہ ۱۹۶۷ء

زیر اہتمام

مسلم احمد نظامی۔ ایم۔ اے

ناشر

کتب خانہ نذیریہ، مسلم منزل، کھاری باؤلی، دہلی۔

قیمت — تین روپے

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم

کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اقبالؒ

فہرستِ عنوانات

حضورِ حق
حضورِ رسالتؐ
حضورِ ملت
انا الحق
رُومی
پیامِ فاروقؓ
خلافت و ملوکیت
ترکِ عثمانی
دُخترانِ ملت
عصرِ حاضر
برہمن

تلاشِ رزق
گہر بچے اپنے سے
حضورِ عالمِ انسانی
دِل
خودی
جبر و اختیار
مَوت
بگو ابلیس را
ابلیسِ خاکی و ابلیسِ ناری
بہ یارانِ طریق

طارق اور خدمتِ اقبالیات

میرے دوست حضرتِ طارق علامہ اقبالؒ کے اُن عقیدت مندوں میں سے ہیں جنھوں نے حقیقۃً اپنی زندگیاں علامہ اقبال کے پیغام کی نشر و تبلیغ کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ طارق صاحب نے متعدد ضخیم تالیفات کے ذریعے سے کلامِ اقبال کے اکثر پہلوؤں کو روشن کیا ہے اور عام پڑھے لکھے انسانوں کو علامہ کے ادب و شعر اور اُن کی تعلیمات پر غور کرنے کا موقع بہم پہنچایا ہے۔ وہ سراپا تعلیماتِ اقبال کے نشے میں چُور ہیں اور چاہتے ہیں کہ دُوسروں کو بھی اُس نشے میں سرشار کر دیں۔

طارق صاحب نے قسامِ ازل سے شعر گوئی کے لئے ایک فطری اور وہبی صلاحیت پائی ہے۔ وہ از سرتاپا ایک اسلامی شاعر ہیں۔ شارعِ اسلام، دینِ اسلام، فلسفۂ اسلام اور سیاسیاتِ اسلام سے انہیں والہانہ عشق ہے۔ علامہ اقبال کے فارسی کلام کو سمجھنے اور اس کے مطالب و معانی سے بہرہ اندوز اور متاثر ہونے کے لئے بہر حال ایک خاص درجے کے علم کی ضرورت ہے۔ عوام اور کم خواندہ اشخاص اُن کے کلام سے براہِ راست مستفید نہیں ہو سکتے۔ لیکن طارق صاحب نے عام فہم انداز میں علامہ کے مطالب کو نظم کر کے اُن کے افادے کے دائرے کو وسیع تر کر دیا ہے۔ اقبال کی فارسی نظموں کے تراجم سے اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے علامہ مرحوم کا نقطۂ نگاہ اور ان کی تعلیمات عوام تک پہونچ جائیں۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی خدمت ہے، اور طارق صاحب مستحقِ مبارکباد ہیں کہ وہ اس خدمت کو بوجہِ احسن انجام دے رہے ہیں!"

(مولانا) عبدالمجید سالک

تراجم پر ایک نظر

(از مولانا عبدالرحمن صاحب شوق مدیر ماہنامہ ہمایوں لاہور)

عام طور پر نثر میں بھی ترجمے کا حق ادا کرنا اور اس کی صفات و مقتضیات سے کماحقہ، عہدہ برآ ہونا ایک نہایت دشوار مہم ہے۔ چہ جائیکہ علامہ اقبال کی فارسی منظومات کو، جو اکثر دقیق فلسفیانہ افکار و تصورات سے معمور ہیں، اردو نظم کا لباسِ حسین پہنایا جائے لیکن طارق صاحب جس چابکدستی، قادر الکلامی، حسن انداز، چستیٔ بندش اور سلامتیٔ مفہوم کے ساتھ اقبال کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرگئے ہیں، وہ ان کے خامۂ عنبر شمامہ کا ایک معجز نما اور محیر العقول کارنامہ ہے۔ چونکہ میں ذیل میں متعدد تراجم اصل فارسی رباعیات سمیت آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ لہذا تراجم کی فنی خوبیوں کے متعلق کوئی طویل مضمون لکھنا ایک غیر ضروری تکلف معلوم ہوتا ہے۔ قارئینِ کرام کا ذوقِ سلیم اور احساسِ شعر و نغمہ تراجم کے لفظی و معنوی محاسن کا از خود اندازہ کرلے گا۔ فنی اور ادبی حیثیت سے "ارمغان حجاز" کا یہ اردو ترجمہ اپنی عظمت و تکمیل پر شاہد عادل ہے میں یہاں اس قدر ضرور عرض کردوں گا کہ طارق صاحب کا ترجمہ صرف مکمل ترجمہ ہی نہیں بلکہ اکثر جگہ علامہ اقبال کے اصل معانی و مقاصد کی نہایت دلپذیر، حقیقت رس اور بصیرت افروز تشریح و توضیح بھی ہے۔ اس طرح طارق صاحب ایک خاص ادبی سلیقے سے "بیک کرشمہ دو کار" کا حق ادا کرگئے ہیں، اور یہ ایجاز اختصار کی وجہ سے بھی خوبی ہے

جو عہدِ حاضر کے دیگر تراجم میں نہیں پائی جاتی۔ الغرض تراجم کو بہ نگاہِ انصاف مطالعہ کر لینے کے بعد بلا تامل اس حقیقتِ صادقہ کا اعلان کیا جا سکتا ہے کہ وقت کے مستند ترین شارحِ اقبالیات (طارق) نے اُردو ادب میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا حکمت افزا اور روح پرور کارنامہ پیش کیا ہے۔ فارسی زبان پر عبور نہ رکھنے والے عاشقانِ کلامِ اقبالؔ فارسی تصنیفاتِ اقبالؒ کے معانی سمجھنے کے لئے نہایت تشنہ و مضطرب رہا کرتے تھے۔ طارقؔ صاحب نے یہ تراجم پیش کر کے اُن کے لئے افکارِ اقبال کے کچھ نئے زندگی بخش چشمے کھول دیئے ہیں۔ اب اِن سے کما حقہ سیراب ہونا ان کے اپنے ذوق و شوق پر منحصر ہے۔

"ارمغانِ حجاز"

تحفۂ ایمان دیتی ہے تجھے رُوحِ حجاز
اور اُس ایمان کا ہے ترجماں یہ ارمغاں!
عشقِ حق، عشقِ نبی، عشقِ خلافت، عشقِ دیں
اس کتابِ پاک کے ہے نقطے نقطے میں نہاں!
حرّیت کا غیر فانی درس ہے اس کا کلام
حُسنِ فطرت کی جلا ہے اس صحیفے کی زباں!
مخزنِ حکمت ہے جو قطعہ بھی اس کا دیکھیے
بند ہے کوزے میں گویا ایک بحرِ بے کراں!
وہ عمل جس سے کہ پائے فرد و ملّت کا جلال
کر دیئے ہیں حضرت اقبال نے اس میں بیاں

ہے اگر مطلوب تجھ کو شوکت علم و عمل
اے مسلماں! اس کے معنی کو بنالے حرزِ جاں!
اس حقیقت کی بشارت دے رہی ہے یہ کتاب
سب ہیں فانی اس جہاں میں تو مگر ہے جاودان
یہ بتاتی ہے کہ "مومن" ہی ہے روحِ کائنات
اور کرتی ہے تجھے قلب و نظر کا پاسباں!
اس کے شعرِ عطر زا سے ہو اگر توفیق یاب
دِل ترے سینے میں ہو جائے گا رشکِ گلستاں!
میں بتاؤں کب تلک اس کی تجھے وجدانیات
ذوقِ صالح خود معانی کا بنے گا راز داں!
میں تو اتنا جانتا ہوں، اس کے سوز و کیف سے
پیر بھی واللہ بن سکتا ہے اک مردِ جواں!
اس کے پڑھنے سے ہمیں ملتا ہے ایمانِ کلیم
یہ مسلماں کو دکھاتی ہے صراطِ مستقیم

طارق

دیباچہ

میرے نزدیک علامہ اقبال کے فارسی کلام کا بہترین حصّہ اُن کے قطعات ہیں۔ نہ صرف چستیِ بندش، حسنِ ترتیب اور فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے وہ عدیم النظیر ہیں، بلکہ اصلاحی، تعمیری اور افادی حیثیت سے بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چنانچہ "ارمغان حجاز" ایسے ہی فارسی قطعات کا بصیرت افروز مجموعہ ہے۔ جس میں عشقِ حق، عشقِ رسول ؐ اور عشقِ قوم و ملّت اپنے پورے تموّج پر ہے۔ یہ قطعات اوّل تا آخر حکمت و موعظت کے انقلاب انگیز عناصر سے معمور ہیں اور مسلمان کو غیوریت و حریّت، حفظِ خودی، سخت کوشی، عزم و استقلال اور حق گوئی و حق پرستی کا ناقابلِ فراموش درس دیتے ہیں۔ لفظی اور معنوی ہر دو لحاظ سے ان کا مقام اس لئے بھی بلند تر ہے کہ یہ علامہ اقبال کے آخری حصّہء عمر کی تخلیق ہیں، جب کہ حکیم الامت کے فکر و نظر کا پرندہ ازمان و مکان کی رسمی حدود کو توڑ کر عالمِ لاہوت کی سیر کیا کرتا تھا، اور قلبِ حق اندیش ہمہ وقت

عشق و مستی کے بحرِ ناپیدا کنار میں غرق رہتا تھا۔

فارسی اگرچہ مسلمانوں کی ایک موقّر، شیریں اور جواہرِ علم و ادب سے معمور زبان ہے، تاہم جو لوگ پاکستان میں تسلی بخش طور پر اِس زبان سے باخبر ہیں، انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اوّل تو بذاتِ خود فارسی زبان کے جاننے اور سمجھنے والے ہی بہت کم ہیں، چہ جائیکہ علامہ اقبالؔ کی فارسی شاعری کے اسرار و غوامض تک رسائی ہو، جو فلسفیانہ اندازِ بیان کی وجہ سے عموماً دقیق و عمیق واقع ہوئی ہے!

پس میں نے "ارمغانِ حجاز" کو اُردو نظم میں اس لئے منتقل کیا ہے کہ جو لوگ فارسی زبان پر حاوی نہیں، وہ علامہ اقبالؔ کے اُن حیات افروز افکار و احساسات سے فیض یاب ہوں، جو اُن کے فارسی کلام میں تجلی ریز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن عقیدتمندانِ اقبالؔ نے عموماً علامہ مرحوم کا اُردو کلام پڑھا اور اس کے زندگی بخش تاثرات سے محظوظ و مستفید ہوئے، وہ فارسی کلام کو سمجھنے کے لئے بھی ماہیٔ بے آب کی مانند بے چین رہے ہیں۔ میں نے اُن کے باطنی اضطراب اور ذوق و شوق کا مکمل طور پر اندازہ کیا اور پھر اُن کا یہ معنوی مطالبہ پورا کرنے کے لئے ہمہ تن منہمک ہو گیا۔ چنانچہ یہ تراجم (جو اکثر جگہ تشریح کا فرض بھی

از خود بجا لا رہے ہیں) اُسی احساس کا حاصل و نتیجہ ہیں۔ میں نے ترجمہ کرتے وقت اس اصول کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ علامہ اقبالؔ کا حقیقی مفہوم و مقصد کہیں بھی فوت نہ ہو، اور فارسی قطعات کے مطالب و معانی اُردو میں ایک بے تکلف اور غیر تغیر یافتہ صورت میں منعکس ہو جائیں۔ چنانچہ آپ کا ذوقِ صحیح اصل اور ترجمہ ہر دو کے مطالعہ سے اس موضوع کے متعلق از خود ایک آزاد و منصفانہ فیصلہ مرتب کر سکتا ہے!

میں اس ضمن میں امامِ فن مولانا عبدالمجید صاحب سالکؔ کا خاص طور پر ممنون و شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا مسودہ اوّل تا آخر نہایت غور و خوض سے ملاحظہ فرمایا۔ ہر ہر شعر کو اپنے بے مثل عیار تنقید پر پرکھا، اور متعدد جگہ لفظی و معنوی ہر دو لحاظ سے ایسی حسین و دل پذیر اصلاحیں دیں، جن سے تراجم کی فنی حیثیت کو چار چاند لگ گئے!

عبدالرحمٰن طارق

دلِ ما بیدلاں بردند و رفتند

حضورِ حق

خوش آں راہی کہ سامانے نگیرد
دلِ او پندِ یاراں کم پذیرد
بہ آہے سوزناکش سینہ بکشائے
زیک آہش غمِ صد سالہ میرد

خوب ہے وہ بھی مسافر جو نہ لے سامان و ساز
اور دل بھی پندِ یاراں سے ہو اُس کا بے نیاز
تو جو سینہ کھولے اُس کے نالۂ پرسوز پر
رنجِ صد سالہ مٹا دے اُس کی اِک آہ گداز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضورِ حق

۱

دلِ ما بیدلاں بردند و رفتند
مثالِ شعلہ افسردند و رفتند
بیا یک لحظہ با عاماں درآمیز
کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

بے دلوں نے قلب میرا لے لیا، رخصت ہوئے
اُن کا شعلہ بھی بالآخر بجھ گیا، رخصت ہوئے
آ، عوام النّاس کی محفل میں ہو اب جلوہ ریز
خاص لوگوں نے تو خُم بھی پی لیا، رخصت ہوئے

سخن ہا رفت از بود و نبودم
من از خجلت لبِ خود کم کشودم
سجودِ زندہ مرداں می شناسی
عیارِ کارِ من گیر از سجودم

تھی محلِ گفتگو اب تک مری بود و نبود[1]
اس ندامت سے نہ پائی میرے ہونٹوں نے کشود
زندہ مردوں کے ہے سجدوں سے تو خود بھی باخبر
دیکھ! ہیں میرے عمل کے ترجماں میرے سجود

[1] بُود: ہستی - نبود: عدم

دل من در کشادِ چون و چند است
نگاہش از مہ و پرویں بلند است
بدہ ویرانۂ در دوزخ او را
کہ ایں کافر بسے خلوت پسند است

چاہتا ہے دل مرا ہر دم کشادِ چون و چند[۱]
ہے نظر اس کی مہ و خورشید و پرویں سے بلند
دل کو میرے کر عطا ویرانہ دوزخ میں کہیں
کیونکہ یہ کافر ہے فطرت میں بہت خلوت پسند

چہ شور است ایں کہ در آب و گلِ افتاد
ز یک دل عشق را صد مشکل افتاد
قرارِ یک نفس بر من حرام است
بمن رحمے کہ کارم با دل افتاد

شور یہ کیسا بپا اس جسمِ آب و گل میں ہے
عشق اک دل کے عمل سے ہر گھڑی مشکل میں ہے
اک نفس کا چین بھی مجھ پر ہوا یکسر حرام
یا الٰہی، رحم! بجلی کون سی اس دل میں ہے؟

جہاں از خود بروں آوردۂ کیست؟
جمالش جلوۂ بے پردۂ کیست؟
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن
بگو با من کہ او پروردۂ کیست

کس کی قدرت نے نمایاں کر دیا ہے یہ جہاں؟
حسن بے پردہ ہے کس کا ذرے ذرے سے عیاں؟
مجھ سے فرماتا ہے تو شیطان سے کر اجتناب
تو بتا شیطان کو کس نے کیا ہے بے عناں[۲]

۱؎ چون: کائنات کی کیفیت۔ چند: تعدادِ اشیا ر ۲؎ بے عناں: بے لگام۔ آزاد

۲۲

دلِ بے قیدِ من در پیچ و تاب ست
دل مرا بے قید ہے، کھاتا ہے ہر دم پیچ و تاب

نصیبِ من عتابے یا خطابیست
ہے غضب تیرا مری قسمت میں یا لطف و خطاب؟

دلِ ابلیس ہم نتوانم آزرد
قلبِ شیطاں کو بھی میں آزردہ کر سکتا نہیں

گناہِ گاہ گاہِ من صوابیست
گاہے گاہے تو گنہ بھی ہے مرا کارِ ثواب!

○

صَبَنْتِ الکاسَ عنّا امَّ عمرٍو
آہ ساقی! جام سے کو ہم ترستے ہی رہے

وکانَ الکاسُ مجراھا الیمینا[۱]
غیر اصحابِ یمیں[۱] کا حق بھی لے کر چل دیئے

اگر این است رسم دوستداری
دوستی کی رسم اگر یہ ہے تو اے عشقِ غیور

بدیوارِ حرم زن جام و مینا
مار دیوارِ حرم سے، جام و مینا توڑ دے!

○ اشارات: صبنت الکاس الخ۔ یہ شعر عمرو ابن کلثوم کا ہے جو زمانہ جاہلیت کے شعرا میں سے تھا۔

شاعر اپنی معشوقہ ام عمرو کی ناانصافی کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو نے ہمیں پیالہ شراب سے محروم کر دیا حالانکہ باری دائیں طرف بیٹھنے والوں کی تھی۔

[۱] اصحابِ یمیں: داہنی طرف والے لوگ۔

○

بخود پیچیدگاں در دل اسیرند
ہمہ دردند و درماں ناپذیرند
بجو از ما چہ میخواہی کہ شاہاں
خراجے از دہِ ویراں نگیرند

عاشقانِ خود کُشند دل میں رہتے ہیں اسیر
ہو کے یکسر درد، وہ بھی رہتے ہیں درماں[1] ناپذیر
کر طلب مجھ سے نہ سمجھے تو کہ شاہانِ جہاں
اک دہِ[2] ویراں سے ہوتے ہی نہیں محصول گیر

○

روم راہے کہ او را منزلے نیست
ازاں تخمے کہ ریزم حاصلے نیست
من از غم ہا نمی ترسم ولیکن
مدہ آں غم کہ شایانِ دلے نیست

گامزن اُس رہ پہ ہوں جس کی کوئی منزل نہیں
بیج وہ ڈالے زمیں میں، جن کا کچھ حاصل نہیں
کثرتِ غم سے میں دنیا میں نہیں ڈرتا، مگر
دے نہ وہ غم جو کہ میرے قلب کے قابل نہیں

مے من از تنک جاماں نگہ دار
شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار
شرر از نیستانے دور تر بہ
بخاصاں بخش و از عاماں نگہ دار

یاالٰہی مے کو میری رکھ تنک جاموں سے دُور
یہ شرابِ پختہ ہے، کر اس نئے خاموں سے دُور
خوب ہے گر نیستاں سے دُور چنگاری رہے
قلبِ خاصاں کو یہ دے، رکھ عام انسانوں سے دُور

[1] درماں ناپذیر، دوا قبول نہ کرنے والے [2] دہ: گاؤں

○

ترا ایں کشمکش اندر طلب نیست
ترا ایں درد و داغ و تاب و تب نیست
ازاں از لامکاں بگریختم من
کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست

کشمکش سے ہجر کی محروم ہے تیری طلب
دل میں تیرے ہے کہاں یہ درد و داغ و تاب تب
لامکاں سے اس لئے گھبرا کے میں نے کی گریز
ہیں وہاں مفقود یکسر نالہ ہائے نیم شب

○

ز من ہنگامہ دہ ایں جہاں را
دگرگوں کن زمین و آسماں را
ز خاک ما دگر آدم بر انگیز
بکش ایں بندہ سود و زیاں را

کر مرے حملوں سے تو معمور شورش یہ جہاں
ضرب سے میری بدل نقش زمین و آسماں
خاک سے میری اُٹھا اک آدمِ محشر طراز
محو کر دے دہر سے یہ بندۂ سود و زیاں

○

جہانے تیرہ تر با آفتابے
صواب او سراپا ناصوابے
ندانم تا کجا ویرانۂ را
دہی از خونِ آدم رنگ و آبے

اس جہاں کو تیرہ تر کرتا ہے نورِ آفتاب
درحقیقت ہے ثواب اس کا سراپا ناثواب
کچھ نہیں معلوم کب تک دہر کے ویرانے کو
خونِ آدم ہی سے تو دیتا رہے گا رنگ و آب

غلامم جز رضائے تو نجویم
جز آں راہے کہ فرمودی نپویم
ولیکن گر بہ ایں ناداں بگوئی
خرے را اسپِ تازی گو، نگویم

ہوں ترا بندہ، مرا مقصد ہے بس تیری رضا
تیری راہِ راست ہی پر میں سدا چلتا رہا
تو اگر دے حکم مجھ کو خر کو کہہ اسپِ اصیل
منحرف ہو جاؤں گا، کہنا نہ مانوں گا ترا

۳

دلے در سینہ دارم بے سرورے
نہ سوزے در کفِ خاکم نہ نورے
بگیر از من کہ بر من بار دوش است
ثوابِ ایں نمازِ بے حضورے

دل مرے سینے میں ہے، لیکن ہے بے کیف و سرور
خاک میں میری ہے ناپید ازل کا سوز و نور
ہے ثوابِ ذکر بھی میرے لئے تو بارِ دوش
چھین لے مجھ سے الٰہی یہ نمازِ بے حضور

چہ گویم قصۂ دین و وطن را
کہ نتواں فاش گفتن ایں سخن را
مرنج از من کہ از بے مہری تو
بنا کردم ہماں دیرِ کہن را

میں بیاں کیسے کروں یہ قصۂ دین و وطن
آشکارا کہہ نہیں سکتا کہ ہے نازک سخن
کیوں خفا ہوتا ہے، تیری سرد مہری کے طفیل
میں نے دنیا میں بنایا ہے وہی دیرِ کہن[1]

۱؎ دیرِ کہن سے مراد ہیں بتانِ وہم و گمان جو بعثتِ نبوی سے پیشتر عرب میں عام تھے۔

مسلمانے کہ در بندِ فرنگ است
دلش در دستِ او آساں نیاید
زسیمائے کہ سودم بر درِ غیر
سجودے بوذرؓ و سلماںؓ نیاید

قید میں افرنگ کی ہے جس مسلماں کا وجود
اُس کا دل بھی قید ہے ہوتی نہیں جس کی کشود
جس جبیں کو میں نے رکھا ہے درِ اغیار پر
بوذرؓ و سلمانؓ کے ممکن ہی نہیں اُس سے سجود

نخواہم ایں جہان و آں جہاں را
مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش
بوجد آرم زمین و آسماں را

مدعا میرا نہیں ہے یہ جہاں یا وہ جہاں
بس یہی کافی ہے مجھ کو، جاننا ہے رمزِ جاں
دے مجھے سجدے بھی ایسے جن کے سوز و کیف سے
وجد میں آنے لگیں تیرے زمین و آسماں

چہ میخواہی ازیں مردِ تن آسائے
بہر بادے کہ آمد رفتم از جائے
سحر جاوید را در سجدہ دیدم
بہ صبحش چہرۂ شامم بیارائے

مردِ تن آساں ہوں، کیا ہے مجھ سے تیرا مدعا
جو ہوا بھی چل پڑی میں ساتھ اُس کے اڑ گیا
صبحدم جاوید کو سجدے میں دیکھا میں نے آج
سرخ ہو اُس کی سحر سے چہرہ میری شام کا

۴

به آں قوم از تو می خواہم کشادے
فقیہش بے یقینے، کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نزادے

ایسی ملت میں مجھے مطلوب ہے دل کی کشاد
واعظ و مفتی ہیں جس کے بے یقین و کم سواد
وہ بھی چیزیں میں دیکھ لیں، جو دید کے قابل نہ تھیں
کاش میں پیدا نہ ہوتا، زیست ہے وجہ فساد

○

نگاہِ تو عتاب آلود تا چند
بتانِ حاضر و موجود تا چند
دریں بتخانہ اولادِ براہیم
نمک پروردۂ نمرود تا چند

تیری چشم غیظ ہم پر شعلہ افشاں تابکے؟
اور بتانِ حاضر و موجود رقصاں تابکے؟
اِک صنم خانہ ہے دُنیا، اس میں اولادِ خلیلؑ
ہو کے مومن سائلِ نمرود و شیطاں تابکے؟

○

سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

کیا خبر اُٹھے نہ اُٹھے پھر سرودِ دل گداز
کیا خبر آئے نہ آئے اس طرف بادِ حجاز
اس فقیرِ رہ نشین کا وقت تو ہوتا ہے ختم
دہر میں آئے نہ آئے پھر کوئی دانائے راز

٭ اشارات ۔ مرا اے کاشکے الخ ۔ یہ مصرعہ سعدیؒ کا ہے ۔

اگر می آید آں دانائے رازے
بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیرِ اُمتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

دہر میں آئے کبھی میرے بعد اگر دانائے راز
اُس کی فطرت کو عطا کر اک نوائے دل گداز
اُمتوں کے دِل کو شرک و کفر سے کرتا ہے پاک
یا کلیمِ پُر جلال و یا حکیمِ نے نواز

متاعِ من دلِ درد آشنائے است
نصیبِ من فغانِ نارسائے است
بخاکِ مرقدِ من لالہ خوشتر
کہ ہم خاموش و ہم خونیں نوائے است

دہر میں پونجی ہے میری اِک دِل درد آشنا
میری قسمت میں جو آئی تو فغانِ نارسا
خاکِ مرقد پر مری خوشتر ہے لالہ کی نمود
کیونکہ وہ فطرت میں ہے خاموش اور خونیں نوا

٥

دل از دستِ کسے بردن نداند
غم اندر سینہ پروردن نداند
دمِ خود را دمیدی اندراں خاک
کہ غیر از خوردن و مُردن نداند

یہ کسی کے دِل کو لا سکتا نہیں ہے زیرِ دام
درد و غم مفقود ہیں سینے میں اور فطرت ہے خام
تو نے اُس انسان میں پھونکی ہے اپنی روحِ پاک
کھانے مرنے کے سوا جس کو نہیں ہے کوئی کام

دلِ ما از کنارِ ما میبرہ
بصورت ماندہ و معنی ندیدہ
زِ ما آں راندۂ درگاہ خوشتر
حق او را دیدہ و ما را شنیدہ

قلب میرا میرے پہلو سے گریزاں ہی رہا
غرق صورت ہو کے معنی سے رہا نا آشنا
ہم سے تو وہ راندۂ[1] درگاہِ حق ہے خوب تر
اُس نے دیکھا وہ خدا ہم نے فقط جس کو سنا

نداند جبرئیل ایں ہائے و ہو را
کہ نشناسد مقامِ جستجو را
بپرس از بندۂ بیچارہ خویش
کہ داند نیش و نوشِ آرزو را

جانتا کچھ بھی نہیں جبریل میرے ہائے و ہو
کیونکہ مخفی اُس سے ہے آدم کا ذوقِ جستجو
پوچھ دردِ عشق اپنے بندۂ بیچارہ سے
کیونکہ یہ کھائے ہوئے ہے نیش و نوشِ[2] آرزو

شبے ایں انجمن آراستم من
چو مہ از گردشِ خود کاستم من
حکایت از تغافل ہائے تو رفت
و لیکن از میاں برخاستم من

گرچہ مثلِ ماہ میں گردش سے کم ہوتا رہا
تیری شب کی انجمن کو حسنِ نو میں نے دیا
گفتگو جس بزم میں تیرے تغافل پر ہوئی
میں تری حرمت[3] میں اُس محفل سے فوراً اٹھ گیا

۱؎ مُراد شیطان ۲؎ نیش و نوش: تلخی و شیرینی ۳؎ حرمت بمعنی عزت۔

چنیں دَورِ آسماں کم دیدہ باشد
کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دَیرے بنا کردند آنجا
پرستد مومن و کافر تراشد

آسماں نے بھی نہ دیکھا ہوگا ایسا روزگار
جس کی غفلت پہ ہے خود جبریل کا دل بیقرار
کفر نے جو بھی بنایا اس میں دیرِ خوش نما
"مومنِ مشرک" اُسے پوجا کیا لیل و نہار

٦

عطا کن شورِ رومی، سوزِ خسرو
عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی
چناں با بندگی در ساختم من
نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی

دل کو میرے سوزِ خسرو شورِ رومی کر عطا
گفتگو میں صدق و اخلاصِ سنائی کر عطا
اُس مقامِ خاص پر پہونچی ہے میری بندگی
میں نہیں لوں گا اُسے، تو گو "خدائی" کر عطا

٧

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است
ز کارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقشِ دگر ملّت بریزیم
کہ ایں ملّت جہاں را بارِ دوش است

عہدِ حاضر کا ہے مسلم فاقہ مست و ژندہ[١] پوش
اور ہیں اس کے عمل جبریل کو وجہ خروش
آ، نئی ملّت کریں اس دیرِ کہنہ سے بپا
کیونکہ یہ ملّت ہے دنیا کے لئے اب بارِ دوش

[١] ژندہ: گدڑی، چیتھڑا۔

○

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد
دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
نگردد با یکے عالم رضامند
دو عالم را بدوش خویش گیرد

وہ نئی ملت کرے جو دہر میں برپا خروش
اور ہنر جس کا بنائے نیش[1] کو بھی رشکِ نوش[2]
ایسی ملت، ایک ہی عالم پہ جو قانع نہ ہو
بلکہ قوت سے کرے ہر دو جہاں کو زیرِ دوش

○

دگر قومے کہ ذکرِ لا الٰہش
برآرد از دلِ شب صبحگاہش
شناسد منزلش را آفتابے
کہ ریگِ کہکشاں روید ز راہش

ایک ایسی زندہ ملت، جس کا ذکرِ لا الٰہ
قلبِ شب سے آشکارا کر دے نورِ صبح گاہ
ایک ایسی قوم، منزل جس کی ہو خورشید و ماہ
اور ریگِ کہکشاں بن جائے جس کی گردِ راہ

۸

جہانِ تست در دستِ خسے چند
کسانِ او بہ بندِ ناکسے چند
ہنرور در میانِ کارگاہاں
کشد خود را بہ عیشِ کرگسے چند

حکم ہے تیرے جہاں کا مردمِ خس[3] کے لئے
کس[4] ہے مغلوبِ ستم ہر فردِ ناکس کیلئے
کارخانوں میں بھی دیکھو جا کے جب اہلِ ہنر
مثلِ قمری مر رہے ہیں عیشِ کرگس[5] کے لئے

۱؎ نیش: زہر ۲؎ نوش: شہد ۳؎ خس: کمینہ، کنجوس ۴؎ کس: قابل اور روشن طبع شخص ۵؎ کرگس: گدھ

○

مریدے فاقہ مستے گفت با شیخ	پیر سے کہنے لگا اک دن مُرید فاقہ مست
کہ یزداں را ز حالِ ما خبر نیست	ہے مرا خالق بھی میرے حال سے بےخبر
بہ ما نزدیک تر از شہ رگ ماست	شاہ رگ سے گرچہ ہے نزدیک تر اس کا وجود
و لیکن از شکم نزدیک تر نیست	پیٹ سے پاتا نہیں ہوں اُس کو میں نزدیک تر

۹

دگر گوں کشورِ ہندوستاں است	ہے دگرگوں آج کل یہ کشورِ ہندوستاں
دگر گوں آں زمین و آسماں است	اور نرالے رنگ میں ہیں وہ زمین و آسماں
مجو از ما نمازِ پنجگانہ	کر نہ ہم سے تو نمازِ پنجگانہ کی طلب
غلاماں را صف آرائی گراں است	ہے غلاموں کے لیے کارِ صف آرائی گراں

○

ز محکومی مسلماں خود فروش است	ہو رہا ہے آج محکومی سے مسلم خود فروش
گرفتارِ طلسمِ چشم و گوش است	اور مسلّط اُس پہ ہے قیدِ طلسمِ چشم و گوش
ز محکومی رگاں در تن چناں سست	جورِ محکومی سے اتنی سُست ہیں تن میں رگیں
کہ ما را شرع و آئیں بارِ دوش است	ہو رہی اب شریعت بھی ہمیں تو بارِ دوش

۱۰

یکے اندازہ کن سود و زیاں را
چو جنت جاودانی کن جہاں را
نمی بینی کہ از خاکی نہاداں
چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

کر معین بھی کہیں اندازۂ سود و زیاں
مثلِ جنت، اس جہاں کو دے حیاتِ جاوداں
دیکھ! تیرے آدمِ خاکی کی محنت کے طفیل
رشکِ فردوسِ بریں ہے آج تیرا خاکداں

۱۱

تو می دانی حیاتِ جاوداں چیست
نمی دانی کہ مرگِ ناگہاں چیست
ز اوقاتِ تو یک دم کم نہ گردد
اگر من جاوداں باشم زیاں چیست

گو تجھے معلوم ہے کیا ہے حیاتِ جاوداں
تجھ کو لیکن کیا خبر کیا شے ہے مرگِ ناگہاں
تیرے اوقاتِ ابد سے ایک دم ہوگا نہ کم
جاوداں ہو جاؤں میں تو اس میں کیا تیرا زیاں

○

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

جب کہ ہو زیر و زبر یہ عالمِ سود و زیاں
اور ہر مخفی عمل ہو حشر میں یکسر عیاں
کر نہ رسوا ہم کو پیشِ خواجۂ ہر دو سرا
بے حسابِ عاصیاں تو چشم سے اس کی نہاں

بدن واماند و جانم در تگ و پوست
سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

تن ہے میرا ناتواں اور جاں ہے گرمِ ترکتاز[1]
سوئے معمورہ ہے جس میں خواجۂ ذرہ نواز
تو یہیں رہ، محفلِ خاصاں میں غرقِ عیش ہو
میں تو کوئے یار میں جا کر پڑھوں گا اب نماز

[1] ترکتاز: دوڑ دھوپ

حضورِ رسالتؐ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

عزت بخاری

ادب گہ ایک زیرِ آسماں ہے عرش سے نازک
نفس گم کردہ آتے ہیں جنیدؒ و بایزیدؒ اس جا

حضورِ رسالت

"الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل
چھوڑ دے خیمے کو، میرے ساتھ آ خیمہ نشین

کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل"
کیونکہ رہبر بھی ہمارا واقفِ منزل نہیں

خرد از راندنِ محمل فرو ماند
عقل تھک کر رہ گئی، محمل ہے محرومِ سفر

زمامِ خویش دادم در کفِ دل
دستِ دل میں باگ دیں، محکم کریں اپنا یقین

اشارات: الا یا خیمگی الخ۔ منوچہری کا شعر ہے

خیمگی۔ خیمہ نشیں

فرو ہل۔ چھوڑ دے

پیش آہنگ۔ وہ شخص جو رہنمائی کی غرض سے قافلے کے آگے آگے چلتا ہے

نگہے داشتم بر جوہرِ دل
تپیدم آرمیدم در برِ دل
رمیدم از ہوائے قریہ و شہر
بہ بادِ دشت واکردم درِ دل

میں سدا دیکھا کیا اپنے ہی دل کی آب و تاب
اور اسی کاشانے میں پایا سکون و اضطراب
شہر و قریے کی ہوا سے میں نے کی ہر دم گریز
کیونکہ بادِ دشت میں پاتا ہے میرا دل شباب

ندانم دل شہیدِ جلوۂ کیست
نصیب او قرارِ یک نفس نیست
بصحرا بردمش افسردہ تر گشت
کنارِ آبجوئے زار بگریست

کیا خبر کس کی نظر نے کر دیا دل کو فگار
اِک نفس کو بھی اسے حاصل نہیں ہوتا قرار
دشت میں جب لے گیا دل کو ہوا افسردہ تر
جب کنارِ آب جو آیا تو رویا زار زار

مپرس از کاروانِ جلوہ مستان
ز اسبابِ جہاں برکندہ دستاں
بجانِ شاں ز آوازِ جرس شور
چو از موجِ نسیمے در نیستاں

پوچھ مت جاتا کہاں ہے اہلِ دل کا کارواں
چھوڑ کر سارا جہاں ہیں کوئے جاناں کو دواں
روح میں انکی ہے آوازِ جرس سے یوں خروش
جس طرح موجِ ہوا سے ہو نیستاں کا سماں

○

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
گشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

عالمِ پیری میں یثرب کی طرف میں چل دیا
اور سرورِ عاشقانہ سے ہُوا نغمہ سرا
اس پرندے کی طرح صحرا میں جو وقتِ مسا[1]
پر کُشا ظلمت میں فکرِ آشیانہ سے ہُوا

۲

گناہِ عشق و مستی عام کردند
دلیلِ پختگاں را خام کردند
بآہنگِ حجازی می سرایم
نخستیں بادہ کاندر جام کردند

پختہ لوگوں کی دلیلوں کو کیا قسمت نے خام
اور گناہِ عشق و مستی بزمِ دنیا میں ہے عام
میں ہوں آہنگِ حجازی پر یہ نغمہ گا رہا
بادۂ یثرب سے کر دے اب مرا لبریز جام

○

چہ پرسی از مقاماتِ نوایم
ندیماں کم شناسد از کجایم
گشادم رختِ خود را اندریں دشت
کہ اندر خلوتش تنہا سرایم

ہم نشیں مت پُوچھ تو میرے مقاماتِ نوا
دوست کیا جانیں کہاں سے میں ہوا ہوں نغما
میں نے صحرائے عرب میں اسلئے کھولا ہے رخت[2]
تاکہ خلوت میں رہوں مستِ نوا، نغمہ سرا

[1] وقتِ مسا: شام کا وقت [2] رخت: ساماں

۳

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بپایش ریگِ ایں صحرا حریر است

صبح ناقے سے کہا میں نے کہ آہستہ سے چل
کیونکہ راکب ہے ترا بے طاقت و بیمار و پیر
میرے کہنے پر ہوئی وہ اور بھی یوں تیز رو
ریگِ صحرا بھی ہے گویا پاؤں کے نیچے حریر

مہار اے سارباں او را نشاید
کہ جانِ او چو جانِ ما بصیر است
من از موجِ خرامش می شناسم
چو من اندر طلسمِ دل اسیر است

سارباں! ناقے کو میری باندھیو کوئی مہار
مثل میری روح کے ہے روح اسکی بھی بصیر
مجھ پہ ظاہر کر رہی ہے اُسکی یہ موجِ خرام
ہے طلسم قلب[1] میں میری طرح وہ بھی اسیر!

نمِ اشک است در چشمِ سیاہش
دلم سوزد ز آہِ صبح گاہش!
ہماں مے کو ضمیرم را بر افروخت
پیاپے ریزد از موجِ نگاہش

اشک سے لبریز ہے ناقے کی بھی چشمِ سیاہ
دردِ دل میرے لئے ہے اُسکی آہِ صبح گاہ
وُہ شرابِ عشق جس سے دل مرا روشن ہُوا
پے بہ پے برسا رہی ہے اُس کی بھی موجِ نگاہ

۱ طلسمِ قلب۔ دل کا جادو۔ مُراد عشق۔

۴

چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا
درودے خواند و محمل براند
بہ ریگِ گرمِ او آور سجودے
جبیں را سوز تا داغے بماند!

خوب ہے صحرا کہ جس میں حسبِ فرمانِ ودود
کارواں ہو چل رہا اور لب پہ ہو اُس کے درود
ایسے صحرا میں جبیں فرسا ہو ریگِ گرم پر
تاکہ ماتھے سے ہو ظاہر تابشِ[1] داغِ سجود

○

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہ رو آہستہ تر نہ
چو ما ہر ذرّہ او دردمند است

خوب ہے صحرا کہ جس کی شام بھی ہے صبح خند
رات ہے کوتاہ اُس کی اور دِن بےحد بلند
راہرو! للہ رکھ اپنا قدم آہستہ تر
ہے مری مانند ہر ہر ذرّہ اس کا دردمند

۵

امیرِ کارواں! آں اعجمی کیست
سرودِ او بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابی آں
خنک دل در بیاباں تواں زیست

اے امیرِ کارواں! یہ کون ہے اعجمی؟
جس کی موسیقی ہے آہنگِ حجازی سے تہی
دشت کی خلوت میں ہے اس شان سے نغمہ سرا
رشکِ جنت جس سے ہو صحرا میں اپنی زندگی

؎ اشارات: اعجمی: عجم کا رہنے والا، غیر عرب ۔ ۱؎ تابش: روشنی

٥

مقامِ عشق و مستی منزلِ اوست
چہ آتش ہا کہ در آب و گِلِ اوست
نوائے او بہ ہر دل سازگار است
کہ در ہر سینہ قاشے از دلِ اوست

عشق و مستی کا مقام اس مرد کی منزل سمجھ
آتشِ "اللہ ہو" تخمیرِ آب و گِل سمجھ
ہے نوا اس کی ہر اک انسان کے دِل کو سازگار
یعنی ہر سینے میں اس غازی کی قاشِ دل سمجھ

٦

غمِ پنہاں کہ بے گفتن عیاں است
چو آید بر زباں یک داستاں است
رہے پُرپیچ و راہی خستہ و زار
چراغش مردہ و شب درمیاں است

بن کہے میرا غمِ پنہاں ہوا سب پر عیاں
گر کروں اُس کو بیاں کہنی پڑے اک داستاں
راستہ پُرپیچ، ہے راہی ہے خستہ اور زار
شمع اُس کی مردہ ہے اور شب ابھی ہے درمیاں

٥

بہ راغاں لالہ رُست از نو بہاراں
بصحرا خیمہ گستردند یاراں
مرا تنہا نشستن خوشتر آید
کنارِ آبجوئے کوہساراں

دشت میں لالہ اُگاتی ہے ہوائے نو بہار
ریگِ صحرا پر ہیں خیمہ زن مرے سب دوست یار
مجھ کو ہے لیکن وہی خاموش تنہائی عزیز
جس میں بیٹھا ہوں کنارِ آبجوئے کوہسار

۷

گہے شعر عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے سار بانم

ہوں میں اشعار عراقی پر کبھی تو نغمہ خواں
اور کبھی گفتار جامی سے ہوں میں آتش بجاں
گو میں آہنگ عرب کا محرم و ماہر نہیں
ہے زباں لیکن شریکِ نغمہ ہائے سارباں

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے سارباں راہِ درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

کر مسافر کا غمِ الفت نشاط آمیز تر
اور کر آہ و فغاں کو بھی جنوں انگیز تر
ہے یہی بہتر کہ لے جائے سارباں راہِ دراز
تاکہ ہو سوزِ جدائی دل میں میرے تیز تر

۸

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوییم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

ہم نفس! آ مل کے روئیں، عشق کا پائیں جلال
ہم محمدؐ کے ہیں دونوں کشتۂ شانِ جمال
پائے خواجہؐ پر ملیں آنکھیں کہیں دل کی مراد
ہے یہی درگاہ کی الفت میں مومن کا کمال

حکیماں را بہا کمتر نہادند
بنادان جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے، چہ خرم روزگارے
درِ سلطاں بہ درویشے کشادند

اہلِ حکمت کو یہاں حاصل نہیں کچھ امتیاز
بلکہ ناداں کو عطا کرتے ہیں مستی کا فراز[1]
کس قدر خوش بخت ہے اور کتنا خرم روزگار
آہ! جب درویش پر سلطاں کا دروازہ ہو باز

جہانِ چار سو اندر برِ من
ہوائے لامکاں اندر سرِ من
چو بگذشتم ازیں بامِ بلندے
چو گرد افتاد پرواز از پرِ من

ہے مری آغوش میں مخفی جہانِ چار سُو
میں مگر رکھتا ہوں سیرِ لامکاں کی آرزو
طاقتِ پرواز گردِ راہ بن کر گر گئی
جب اُڑا میں چھوڑ کر دنیائے دوں کے کاخ و کُو

دریں وادی زمانی جاودانی
ز خاکش بے صور روید معانی
حکیماں با کلیماں دوش بر دوش
کہ اینجا کس نگوید لن ترانی[3]

وادیٔ یثرب میں یہ جلتے ہیں خلقی جلوداں
اس زمیں سے بے صور[2] ہوتے ہیں سب معنی عیاں
ہے حکیموں اور کلیموں میں یہاں ربط کمال
لن ترانی[3] اس جگہ کہتی نہیں کوئی زباں

[1] فراز: بلندی [2] صور: جمع صورت [3] یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔

۹

مسلمان آں فقیرِ کج کلاہے
رمید از سینۂ او سوزِ آہے
دلش نالد چرا نالد؟ نداند
نگاہے یا رسول اللہؐ نگاہے

وہ مسلماں جو رہا اب تک فقیرِ کج کلاہ
آج رخصت ہو رہا ہے اُس کے دل سے سوز و آہ
قلب کیوں نالاں ہے اُس کا یہ بھی وہ سمجھا نہیں
اک نگاہِ لطف اِدھر بھی یا رسول اللہ نگاہ!

○

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تست
نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

میری تاب و تب کا سبب ہے تری الفت کا غم
ہے مرے سوزِ نوا میں بھی تری تاثیرِ دم
رو رہا ہوں اس لئے ہمدم کہ ملکِ ہند میں
ایک محرم[۱] بھی نہیں تیرا، کرم مولا کرم

○

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے را گذر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق
مسلمانے ز ما بیچارہ تر نیست

شب جو ہے ہندی غلاموں کی نہیں آتی سحر
اس زمیں پر مہر کا ہوتا نہیں ہرگز گزر
گوشۂ چشمِ محبت اس طرف وا کیجئے
ہم مسلمانوں سے کوئی بھی نہیں بیچارہ تر

۱ محرم۔ رازدار

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے
مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بامِ بلندے

کیا مسلماں کی کہوں، جو تھا فقیرِ دردمند
اصل میں ہماں میں بے حد نجیب[۱] و ارجمند
سخت جاں مسلم کا ہو اللہ حافظ اور نصیر
خاک پر آ کے گرا ہے چھوڑ کر بامِ بلند

چساں احوالِ او را بر لب آرم
تو می بینی نہان و آشکارم
ز رودادِ دو صد سالش ہمیں بس
کہ دل چوں کندۂ قصاب دارم

عرض میں کیونکر کروں ملت کا اپنی حالِ زار
جانتا ہے تو مرے دل کا نہان و آشکار
اُن دو صد سالوں سے جو گزرے ہیں اُمت پر یہی
کندۂ قصاب کی صورت ہے دل میرا فگار[۲]

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کارِ بے نظامِ او چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است

چرخِ نیلی فام ابھی ہے بہرِ مسلم کج خرام
کارواں ملت کا ہے اب بھی بہت دور از مقام
کیا کہوں اُس کا عمل کتنا ہے محرومِ نظام
جانتا ہے تو کہ ملت ہے ابھی تک بے امام

۱؎ نجیب: شریف، بلند فطرت ۲؎ فگار، زخمی۔

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش
نروید لالہ از کشتِ خرابش
نیامِ او تہی چون کیسۂ او
بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

بے نصیب سوز ہے مسلم کا اب تک خونِ ناب
کر سکی لالہ نہ پیدا اس کی یہ کشتِ خراب
اس کے کیسے کی طرح خالی رہا اس کا نیام
اور طاقِ خانۂ ویراں پہ رکھی ہے کتاب[1]

دل خود را اسیرِ رنگ و بو کرد
تہی از ذوق و شوق و آرزو کرد
صفیرِ شاہبازاں کم شناسد
کہ گوشش با طنینِ پشہ خو کرد

قلب کو مسلم نے کر ڈالا اسیرِ رنگ و بو
اُس کے سینے میں نہیں ہے ذوق و شوق و آرزو
کس طرح سمجھے یہ اب شانِ صفیر[2] شاہباز
کیونکہ کانوں کو ہے مچھر کی صدا سننے کی خو

بروئے او درِ دل ناکشادہ
خودی اندر کفِ خاکش نزادہ
ضمیرِ او تہی از بانگِ تکبیر
حریمِ ذکرِ او از پا فتادہ

بند قدرت نے کیا ہے بہرِ مسلم دل کا باب
اُس کی کشتِ خاک میں اب تک خودی ہے محوِ خواب
ہے ضمیر اس کا تہی تکبیر کی آواز سے
اور حریمِ ذکر بھی اُس کا ہے ویران و خراب

۱؎ کتاب: مراد قرآن مجید ۲؎ صفیر: آواز

گریباں چاک و بے فکر رفو زیست
نمیدانم چساں بے آرزو زیست
نصیبِ اوست مرگِ ناتمامے
مسلمانے کہ بے اللہ ھو زیست

جی رہا ہے وہ گریباں چاک، بے فکر رفو!
کچھ نہیں معلوم کیوں کر زندہ ہے بے آرزو
اس کی قسمت میں لکھی ہے ایک مرگ ناتمام
جس مسلماں کے نہیں ہے قلب میں اللہ ہو!

حقِ آں دہ کہ مسکین و اسیر است
فقیر و غیرتِ او دیر میر است
بروئے او درِ میخانہ بستند
دریں کشور مسلماں تشنہ میر است

اس کا حق دے جو کہ ملت میں ہے مسکین و اسیر
اس کی غیرت جاوداں ہے گرچہ وہ خود ہے فقیر
کر دیا تقدیر نے اس پہ درِ میخانہ بند
کشورِ ہندوستاں میں ہے مسلماں تشنہ میر

دگر پاکیزہ کن آب و گلِ او
جہانے آفریں اندر دلِ او
ہوا تیز و بدامانش دو صد چاک
بیندیش از چراغِ بسملِ او

اک جہانِ نو کا مولد پھر بنے مسلم کا دل
اور پھر اک بار ہوں پاکیزہ اس کے آب و گل
تیز ہے طوفانِ باد اور اس کا دامن چاک چاک
دیکھنا بجھ ہی نہ جائے یہ چراغِ مضمحل

○

عروسِ زندگی در خلوتش غیر
کہ دارد در مقامِ نیستی سیر
گنہگاریست پیش از مرگ در قبر
نکیرش از کلیسا، منکر از دیر!

ہے عروسِ زندگی بھی محفلِ مُسلم میں غیر
کیونکہ تعلیمِ فنا میں وہ کیا کرتا ہے سیر
یہ وہ خاطی ہے کہ پیش موت اُترا قبر میں
ہے کلیسا سے نکیر اس کا تو منکر اہلِ دَیر

○

بچشمِ او نہ نورے نے سرور است
نہ دل در سینۂ او ناصبور است
خُدا آں اُمّتے را یار بادا
کہ مرگِ او ز جانِ بیحضور است

چشم سے اُس کی ہوا مفقود وہ نور و سرور
اور سینے میں نہیں موجود قلبِ ناصبور
ہو خدا ہی دوست ایسی اُمّتِ مرحوم کا
موت کا جس کی ہے باعث ایک جانِ بیحضور

○

مسلماں زادہ و نا محرمِ مرگ
ز بیمِ مرگ لرزاں تا دمِ مرگ
دلے در سینۂ چاکش ندیدم
دمِ بگستہ بود و غمِ مرگ

موت کا محرم نہیں ہے موت ہی کا اس کو غم
موت سے لرزاں ہے جبتک ہے بدن میں اسکے دم
میں نے دل دیکھا نہ اس کے سینۂ صد چاک میں
چند انفاسِ فسردہ اور غمِ مرگ و عدم

○

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است
ازو ایمن نہ رومی نے حجازی است
حضورِ تو غمِ یاراں بگویم
بامیدے کہ وقتِ دل نوازی است

ہے ملوکیت جہاں میں سر بسر اک شیشہ باز
اور فتنوں میں اسی کے گھِر گئے روم و حجاز
دوستوں کا غم بیاں کرتا ہوں میں تیرے حضور
ہے یہ وقتِ دل نوازی اور تو ہے دلنواز

○

تنِ مردِ مسلماں پایدار است
بنائے پیکرِ او استوار است
طبیبِ نکتہ رس دید از نگاہش
خودی اندر وجودش رعشہ دار است

جسم ہے مردِ مسلماں کا قوی و پائے دار
اور بنا بھی اُس کے پیکر کی نہایت استوار
جب طبیبِ نکتہ رس نے دیکھ لی اُس کی نگاہ
وہ یہ بولا ہے خودی اس کے جسد میں رعشہ دار

○

مسلماں شرمسار از بے کلاہی است
کہ دینش مُردہ و فقرش خانقاہی است
تو دانی در جہاں میراثِ ما چیست
گلیمے از قماشِ پادشاہی است

ہے مسلماں دہر میں اب شرمسار و بے کلاہ
دین اُس کا مر چکا اور فقر نے لی خانقاہ
جانتا ہے تو کہ دنیا میں مِری پونجی ہے کیا؟
ایک کملی رشک جس پر کر رہے ہیں پادشاہ!

مپرس از من کہ احوالش چسان است
زمینش بدگہر چوں آسمان است
بر آں مرغے کہ پروردی بانجیر
تلاشِ دانہ در صحرا گراں است

پوچھ مت احوال مسلم ہے وہ تجھ پر خود عیاں
ہے زمیں بھی بدگہر اس کی مثالِ آسماں
پرورش تو نے کیا جس مرغ کو انجیر سے
آج صحرا میں تلاشِ دانہ ہے اس پر گراں

بچشمش وانمودم زندگی را
کشودم نکتۂ فردا و دی را
تواں اسرارِ جاں را فاش تر گفت
بدہ نطقِ عرب ایں اعجمی را

چشمِ مسلم کو دکھایا میں نے رازِ زندگی
اور عیاں میں نے کیا ہے نکتۂ فردا و دی
ہو کرم تیرا تو سرِ جاں کہوں میں فاش تر
خواہشِ نطقِ عرب رکھتا ہے تیرا اعجمی

مسلماں گرچہ بے خیل و سپاہے است
ضمیرِ او ضمیرِ پادشاہے است
اگر او را مقامش باز بخشند
جمالِ او جلالِ بے پناہے است

گو مسلماں ہے جہاں میں آج بے خیل و سپاہ
ہے ضمیر اس کا مگر اب بھی ضمیرِ پادشاہ
پھر عطا مسلم کو ہو جائے اگر اس کا مقام
ہے جمال اس کا یقیناً اک جلالِ بے پناہ

خیل : لشکر

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود
حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنّار دار است
حرم چوں دَیر بود او برہمن بود

شیخ کا دامن ہے معمورِ اساطیرِ کہن ۱؎
اور بنائے گفتگو ہے اسکی بس تخمین و ظن ۲؎
شک سے ہے اسلام اُس کا آج بھی زنّار دار
ہے حرم گویا کہ دیر اور شیخ ہے خود برہمن

دگرگوں کرد لادینی جہاں را
ز آثارِ بدن گفتند جاں را
ازاں فقرے کہ با صدیقؓ دادی
بشورے آور ایں آسودہ جاں را

ہے دگرگوں آج لادینی سے احوالِ جہاں
جسم پر شیدا ہیں سب بھولے ہیں لیکن قدرِ جاں
فقر کی برکت سے، جو بخشا گیا صدیقؓ کو
مرکزِ ہنگامہ کر دے پھر یہ جانِ ناتواں

حرم از دیر گیرد رنگ و بوئے
بتِ ما پیرکِ ژولیدہ موئے
نیابی در برِ ما تیرہ بختاں
دلے روشن ز نورِ آرزوئے

اب حرم بھی لے رہا ہے دیر ہی سے رنگ و بو
آج ہے دلبر ہمارا پیرکِ ژولیدہ مو ۳؎
تو نہ پائے گا ہمارے سینۂ تاریک میں
ایک بھی دل، جس میں ہو موجود نورِ آرزو

۱؎ اساطیرِ کہن: پرانے قصے ۲؎ تخمین: اندازہ۔ ظن: گمان، شبہ ۳؎ پیرکِ ژولیدہ مو: پریشان بالوں والی بڑھیا

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند
گریبانِ شہنشاہاں دریدند
چو آں آتش درونِ سینہ افسرد
مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

جب تلک تھے مسجدوں سے باوفا اخلاص شعار
ہم فقیروں نے کیا شاہوں کا دامن تار تار
آتشِ توحید جب سینوں میں افسردہ ہو گئی
صرف درگاہوں پہ ہم کرنے لگے دل کو نثار

مسلماناں بخویشاں در ستیزند
بجز نقشِ دوئی بر دل نہ ریزند
بنالند ار کسے خشتے بگیرد
ازاں مسجد کہ خود از وے گریزند

آج اپنوں سے مسلماں ہو گئے گرمِ ستیز
بغض و نفرت کی زمیں میں ہیں وہ دائم تخم ریز
روتے ہیں گر غیر اک بھی اینٹ اس مسجد سے لے
عمر بھر کرتے رہے ہیں آپ وہ جس سے گریز

جبیں را پیشِ غیر اللہ سُودیم
چو گبراں در حضورِ او سُرودیم
نہ نالم از کسے، می نالم از خویش
کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

پیشِ غیر اللہ ہم نے پے بہ پے سجدے کئے
مثلِ گبراں پیشِ بت محوِ ترنم بھی ہوئے
غیر کا رونا نہیں، روتا ہوں اپنے حال پر
یا نبی! ہم جیسے تیری شان کے لائق نہ تھے

بدستِ میکشاں خالی ایاغ است
کہ ساقی را بہ بزمِ من فراغ است
نگہ دارم درون سینہ آہے
کہ اصلِ او ز دودِ آں چراغ است

مے کشوں کے ہاتھ میں مدت سے ہے خالی ایاغ[1]
کیونکہ ساقی نے ہماری بزم سے پایا فراغ
میں گو ہر آہ کو سینے میں رکھتا ہوں نہاں
یا نبیؐ! بنیاد ہے اس دودِ[2] کی تیرا چراغ

سبوئے خانقاہاں خالی از مے
کند مکتب رہِ طے کردہ را طے
ز بزمِ شاعراں افسردہ رفتم
نوا ہا مردہ بیروں افتد از نے

مدرسہ طے کردہ راہوں کو کئے جاتا ہے طے
خانقاہوں کے سبو میں بھی نہیں اک قطرہ مے
شاعروں کی بزم سے میں اٹھ گیا افسردہ دل
مردہ نغمے ہی بپا کرتی ہے ہر دم اُن کی نے

مسلمانم غریبِ ہر دیارم
کہ با ایں خاکداں کارے ندارم
بایں بے طاقتی در پیچ و تابم
کہ من دیگر بغیر اللہ دچارم

میں ہوں فطرت میں مسلماں اور غریبِ ہر دیار
قلب کو میرے نہیں قیدِ مکانی سازگار
باوجود ناتوانی ہوں میں وقفِ پیچ و تاب
کیونکہ غیر اللہ سے ہونا ہے مجھ کو پھر دوچار

۱۔ ایاغ: پیالہ ۲۔ دود: دھواں

بال بالے کہ بخشدی پریدم
بسوزِ نغمہ ہائے خود تپیدم
مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد
جہاں گردیدم و او را ندیدم

تو نے بخشے تھے جو شہپر اُن سے میں اُڑتا رہا
اور ہمیشہ اپنے سوزِ نغمہ سے تڑپا کیا
مومنِ قاہر کہ جس سے موت بھی چھپائے موت
دہر میں ڈھونڈا بہت، لیکن نہ وہ مجھ کو ملا

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد، نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

پیشِ حق رویا کیا اک رات میں زار و نزار
اور کہا مسلم ہے کیوں دنیا میں یوں برباد و خوار
ناگہاں آئی ندا مسلم ہے اتنا کم بذوق
دل تو رکھتا ہے مگر دل میں نہیں رکھتا نگار

نگویم از فروغ حالے کہ بگذشت
چہ سود از شرحِ احوالے کہ بگذشت
چراغے داشتم در سینۂ خویش
فسرد اندر دو صد سالے کہ بگذشت

کیوں لکھوں اب میں بیاں اپنی گزشتہ فر و فال
فائدہ کیا گر سناؤں آج میں ماضی کا حال
تھا مرے سینے میں روشن اک چراغِ نور پاش
جو گزشتہ دو صدی میں ہو گیا نذرِ زوال

ادبگار: معشوق

نگہبانِ حرم معمارِ دیر است
یقینش مردہ و چشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہِ او تواں دید
کہ نومید از ہمہ اسباب خیر است

جو نگہباں تھا حرم کا، آج ہے معمارِ دیر
مر گیا اُس کا یقین، اب دیکھتا ہے سوئے غیر
کر رہا ہے خود عیاں مُسلم کا انداز نگاہ
وجہ یاس اُس کو نظر آتے ہیں سب اسباب خیر

ز سوزِ ایں فقیرے رہ نشینے
بدہ او را ضمیرے آتشینے!
دلش را روشن و پایندہ گرداں
ز امیدے کہ زاید از یقینے!

سوز جو رکھتا ہے تیرا یہ فقیر رہ نشیں
اِس کی برکت ہی سے دے مسلم کو قلب آتشیں
روشن و پائندہ کر اس کے دلِ خوابیدہ کو
اُن اُمیدوں سے کہ پیدا جن کو کرتا ہے یقیں

گہے افتم گہے مستانہ خیزم
چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہِ التفاتے بر سرِ بام
کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم

میں کبھی گرتا ہوں، مستی میں کبھی ہوں گرم خیز
اور بغیر تیغ و خنجر ہو رہا ہوں خون ریز
ڈال دے مجھ پر خدارا اک نگاہِ التفات
کیونکہ میں ہوں عصر حاضر سے ابھی محو ستیز

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب، کجا میخانۂ شوق
تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

مجھ کو تنہائی عطا کر اور دے آہ و فغاں
سوئے یثرب جا رہا ہوں اک سفر بے کارواں
ہے کہاں میخانۂ شوق اور کہاں مکتب کا روگ
تو بتا مکتب ہے بہتر یا کہ شوق بے کراں

پریدم در فضائے دلپذیرش
پرم تر گشت از ابرِ مطیرش
حرم تا در ضمیرِ من فرو رفت
سرودم آنچہ بود اندر ضمیرش

میں نے اُڑ کر دیکھ لی اُس کی فضائے دلپذیر
پر کو پُرنم کر گیا اُس چرخ کا ابرِ مطیر[1]
دل میں میرے جاگزیں جب سے ہوا عشقِ حرم
میں نے بھی وہ کچھ کہا، کہتا تھا جو اُس کا ضمیر

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

راز جو میں نے بتایا اُس سے ہیں یہ دُور دور
نخل سے میرے نہ کھائی ایک بھی اُگر کھجور
اے امیرِ امتاں! میں تجھی سے داد خواہ
مجھ کو یہ سمجھے غزل خواں ہے جہالت کا وفور

[1] ابرِ مطیر: برسنے والا بادل

○

نہ شعر است اینکہ بر وے دل نہادم
گرہ از رشتۂ معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق
مسِ ایں مفلساں را تاب دادم

میرے نغموں کو نہ دے تو شعر کا ہرگز خطاب
چہرۂ معنی سے میں نے تو اٹھائی ہے نقاب
اس توقع پر کہ شاید عشق کر دے اس کو زر
مفلسوں کے مس[1] کو میں نے کی عطا یہ آب و تاب!

○

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے
بگوشِ مُردۂ پیغامِ جاں گوے
ولے گویند ایں ناحق شناساں
کہ تاریخِ وفاتِ این و آں گوے

تو نے فرمایا کہ دے درسِ حیاتِ جاوداں
مُردہ دل لوگوں کے کانوں کو سنا پیغامِ جاں
مجھ سے کہتے ہیں مگر اس قوم کے حق ناشناس
ہم کو لکھ دیں آپ تاریخِ وفاتِ این و آں

○

زخم از دردِ پنہاں زعفرانی
تراود خوں زچشمِ ارغوانی
سخن اندر گلوئے من گرہ بست
تو احوالِ مرا ناگفتہ دانی

دردِ دل سے ہیں مرے رخسار مثلِ زعفراں
خون کے قطرات برساتی ہے چشمِ ارغواں
مدعا میرا گلو میں بن گیا آکر گرہ
حال میرا بن کہے ہی تجھ پہ ہے ہر دم عیاں

[1] مس: تانبا

زبانِ ما غریباں از نگاہیست
حدیثِ درد منداں اشک و آہیست
کشادم چشم و بربستم لب خویش
سخن اندر طریقِ ما گناہیست

ہم غریبوں کی زباں بنتی ہے گویا اک نگاہ
اور حدیثِ درد منداں ہے ہمیشہ اشک و آہ
چشم تو کھولی ہے میں نے، بند لیکن ہونٹ ہیں
کیونکہ مسلک میں ہمارے ہے سخن یکسر گناہ

خودی دادم زخود نامحرمے را
کشادم در گِل او زمزمے را
بدہ آں نالۂ گرمے کہ از وے
بسوزم جز غمِ دیں ہر غمے را

منکرِ خود کو کیا میں نے خودی سے آشنا
پیکرِ گِل سے کیا ہے چشمۂ زم زم بپا
کر عطا وہ آتشیں نالہ کہ جس کے سوز سے
جز غمِ دیں دہر کے ہر رنج و غم کو دوں جلا

درونِ ما بجز دُودِ نفس نیست
بجز دستِ تو مارا دسترس نیست
دگر افسانۂ غم باکہ گوئیم
کہ اندر سینہ ہا غیر از تو کس نیست

جسم میں میرے نہیں کچھ بھی بجز دودِ نفس
جز ترے ہاتھوں کے کوئی بھی نہیں ہے دسترس
تو بتا کس کو سناؤں اپنے غم کی داستاں
جبکہ سینوں میں بھی ہے آباد تیری ذات بس

غریبے دردمندے نے نوازے
ز سوزِ نغمۂ خود در گدازے
تو می دانی چہ می جوید چہ خواہد
دلے از ہر دو عالم بے نیازے

ہے ترا بندہ غریبِ دردمند و نے نواز
اپنے نغموں ہی سے جس کا قلب ہوتا ہے گداز
جانتا ہے تو کہ میرا مقصدِ اعلیٰ ہے کیا؟
قلبِ زندہ، جو رہے دونوں جہاں سے بے نیاز

نم و رنگ از دمِ بادے نجویم
ز فیضِ آفتابِ تو بروئیم
نگاہم از مہ و پرویں بلند است
سخن را بر مزاجِ کس نگویم

بادے مجھ کو نہیں ہے رنگ و نم کی آرزو
میں تو فیضِ مہر سے تیرے ہی پاتا ہوں نمو!
ہے نظر میری مقامِ ماہ و پرویں سے بلند
مَیں نہیں کرتا کسی کے حسبِ خواہش گفتگو!

در آں دریا کہ او را ساحلے نیست
دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحاؔ گرفتیم
وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

عشق کے دریا کا دُنیا میں کوئی ساحل نہیں
رہنما کوئی وہاں عشاق کا جُز دل نہیں
تُو نے فرمایا تو ہم مکّہ کی جانب ہیں رواں
جُز ترے ورنہ ہماری کوئی بھی منزل نہیں

ؔ اشارات ، بطحا ، کہ مکہ

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفرما ہر چہ می خواہی بجز صبر
کہ ما از وے دو صد فرسنگ دوریم

ہم کو دُھتکاریں نہ در سے، ہم ہیں مشتاقِ حضور
آپ نے جو درد بخشا، اُس سے دل ہے ناصبور
کیجئے ہم سے طلب سب کچھ تحمّل کے سوا
آپ کے عشّاق ہیں صبر و سکوں سے دُور دُور

بہ افرنگی بتاں دل باختم من
زتابِ دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتن بیگانہ بودم
چو دیدم خویش را نشناختم من

میں نے افرنگی بتوں پر کر دیا دل کو فدا
اور تابِ اہلِ بتخانہ ہی سے پگھلا کیا
اس قدر بے گانہ اپنی ذات سے بھی میں رہا
خود کو دیکھا اور پہچانا نہیں، واحسرتا!

مے از میخانۂ مغرب چشیدم
بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی
ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

میں نے مغرب میں جو پی جا کر مئے غفلت اثر
ہے قسم میری کہ ہر قطرہ تھا اُس کا دردِ سر
بزمِ خوبانِ فرنگی میں بھی بیٹھا جب کبھی
کوئی دن دیکھا نہیں اُس روز سے بے سوز تر

فقیرم از تو خواہم ہر چہ خواہم
دلِ کوہے خراشم از برگِ کاہم
مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد
کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

میں ترے در کا گدا ہوں اور تجھی سے دادخواہ
ہو کرم تو کوہ کو کر دوں اسیرِ برگِ کاہ
بن گیا میرے لئے درسِ حکیماں دردِ سر
کیونکہ میں تو ہوں ترا پروردۂ فیضِ نگاہ

نہ با مُلا نہ با صوفی نشینم
تو میدانی کہ من آنم نہ اینم
نویس "الا اللہ" بر لوحِ دلِ من
کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

صوفی و مُلا کا میں ہوتا نہیں ہوں ہم نشیں
جانتا ہے تو کہ یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
حرفِ "الا اللہ" لکھ دے تو جو میرے قلب پر
خود کو اور اللہ کو دیکھوں گا با نُورِ یقیں!

دلِ مُلا گرفتارِ غمے نیست
نگاہے ہست، در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ او
کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

سینۂ مُلا میں دل ہے، دل میں لیکن غم نہیں
چشم میں نورِ نظر ہے، لیکن اس میں نم نہیں
مکتبِ مُلا سے میں ہر دم گریزاں ہی رہا
کیونکہ اس کی ریگِ صحرا میں کوئی زمزم نہیں

سرِ منبر کلامش نیشدار است
کہ او را صد کتاب اندر کنار است
حضورِ تو من از خجلت نگفتم
ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

گرچہ ہے صد ہا کتابوں سے بھری اس کی کنار [۱]
وعظِ مُلّا بر سرِ منبر ہے یکسر نیشدار
میں نے خجلت [۲] سے نہیں کچھ بھی کہا آگے حضورؐ
خود سے وہ پنہاں رہا اور ہم پہ دائم آشکار

○

دلِ صاحبدلاں او بُرد یا من؟
پیامِ شوق او آورد یا من؟
من و مُلّا ز کیشِ دیں دو تیریم
بفرما بر ہدف او خورد یا من؟

قلبِ صاحبدل کو اُس نے، یا کیا میں نے اسیر؟
میں کہ وہ لایا پیامِ اُلفتِ ربِّ قدیر
گرچہ مُلّا اور میں دو تیر ہیں از کیشِ [۳] دیں
تو ہی فرما کس کا بیٹھا ہے ہدف پر جا کے تیر

○

غریبم در میانِ محفلِ خویش
تو خود گو با کہ گویم مشکلِ خویش
از آں ترسم کہ پنہانم شود فاش
غمِ خود را نگویم با دلِ خویش

میں تو اپنی بزم میں بھی ہوں غریب و بے نوا
درد و غم اپنا کہوں کس سے ذرا تو ہی بتا؟
خوف کھاتا ہوں کہ ہو جائے نہ رازِ عشق فاش
اپنے دل سے بھی نہیں کہتا میں اپنا ماجرا

[۱] کنار: آغوش [۲] خجلت: شرمندگی [۳] کیش: ترکش

دلِ خود را بدستِ کس ندادم
گرہ از روئے کارِ خود کشادم
بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار
دو صد بار از مقامِ خود فتادم

دِل نہ اپنا غیرِ حق میں نے کسی کو بھی دیا
بن گئی میری دُعا ہی خود مری مشکل کشا
جُز خدا تکیہ کیا مخلوق پر جب ایک بار
راہ میں دو سو جگہ میں ضعف سے گرتا رہا

ہماں سوزِ جنوں اندر سرِ من
ہماں ہنگامہ ہا اندر برِ من
ہنوز از جوشِ طوفانے کہ بگذشت
نیاسود است موجِ گوہرِ من

سر میں میرے موجزن ہے اب بھی تیرا ہی جنوں
تو نے جو ہنگامے بخشے، ہیں ابھی وہ رہنموں
جوشِ طوفاں جو کبھی ماضی میں حاصل تھا ہمیں
آج بھی میرے گہر[۱] میں اُس سے ہے جوشِ دروں

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست
ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست
تجلی ریز بر چشمم کہ بینی
بایں پیری مرا تابِ نظر ہست

خاک ہوں لیکن ابھی تک مجھ میں ہیں دارائے[۲] شرر
آج بھی رقصاں ہے سینے میں مرے آہِ سحر
میری آنکھوں پر تجلّی ڈال، تا معلوم ہو
ہے بڑھاپے پر بھی میری چشم میں تابِ نظر

۱ گہر: مرادِ دل ۲ دارا: بمعنی دارندہ۔ رکھنے والا

نگاہم زانچہ بینم بے نیاز است
دل از سوزِ درونم در گداز است
من و ایں عصرِ بے اخلاص و بے سوز
بگو با من کہ آخر ایں چہ راز است؟

ہر دو عالم سے نظر رہتی ہے میری بے نیاز
ہو رہا ہے قلب میرا سوزِ باطن سے گداز
عصرِ بے اخلاص ایسا، اور یہاں میری نمود!
تو ہی فرما اس عمل میں کونسا پنہاں ہے راز؟

مرا در عصرِ بے سوز آفریدند
بخاکم جانِ پرشورے دمیدند
چو نخ در گردنِ من زندگانی
تو گوئی بر سرِ دارم کشیدند

سوز سے محروم دُنیا میں مجھے پیدا کیا
جانِ محشر آفریں کی جسم کو میرے عطا
بن رہی ہے زندگی گردن میں میری اک کمند
دار کے تختے پہ گویا ہوں مقید ہو رہا

نگیرد لالہ و گل رنگ و بویم
درونِ سینہ ام مرد آرزویم
غمِ پنہاں بحرف اندر نگنجد
اگر گنجد چہ گویم با کہ گویم!

لالہ ہو گل ہو، نہیں لیتے وہ میرے رنگ و بو
مردہ ہو کر رہ گئی سینے میں میری آرزو
کھپ نہیں سکتا غمِ پنہاں مرا الفاظ میں
اور اگر کھپ جائے بھی کس سے کروں میں گفتگو؟

من اندر مشرق و مغرب غریبم
کہ از یارانِ محرم بے نصیبم
غمِ خود را بگویم با دلِ خویش
چہ معصومانہ غربت را فریبم

مشرق و مغرب میں رہتا ہوں میں تنہا و غریب
دوستانِ رازداں سے بھی ہوں دائم بے نصیب
رنج و غم اپنا سنا لیتا ہوں اپنے قلب کو
سادگی سے اس طرح دیتا ہوں غربت کو فریب

طلسمِ علم حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم
بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم

میں نے ہی توڑا طلسمِ علمِ حاضر کا نظام
دانہ دانہ چن لیا، اور پھونک ڈالا دام دام[1]
ہے خدا شاہد کہ اس کی آگ میں مثلِ خلیل ؑ
پوری بے باکی سے میرے دل نے رکھا ہے قیام

بچشمِ من نگہ آوردۂ تست
فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دو چارم کن بہ صبحِ "من رآنی"
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

تو نے ہی بخشا ہے میری چشم کو نورِ نگاہ
نور نے تیرے دیا ہے دل کو نورِ لا الٰہ
پھر کرا دیدارِ صبحِ "من رآنی"[2] کا مجھے
پھر عطا فرما شبِ تیرہ کو میری تابِ ماہ

[1] حاشیہ صفحہ ۵۹ پر

[2] حاشیہ صفحہ ۵۹ پر

○

چو خود را در کنارِ خود کشیدم
به نورِ تو مقامِ خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبح گاہی
جہانِ عشق و مستی آفریدم

جب کیا حق نے مجھے فطرت کا میری رازداں
نور سے تیرے مری عظمت ہوئی مجھ پر عیاں
دیرِ عالم میں ہے بفیضِ نوائے صبح گاہ
میں نے جس سے ہے بنایا عشق و مستی کا جہاں

○

دریں عالم بہشتِ خرّمے ہست
بشاخِ او ز اشکِ من نمے ہست
نصیبِ او ہنوز آں ہاؤ ہو نیست
کہ او در انتظارِ آدمے ہست

ہے اسی دنیا میں پیدا اک بہشتِ خوش گوار
تازہ میرے اشک سے رہتی ہے جس کی شاخسار
اس کی قسمت میں نہیں لیکن ابھی وہ ہاؤ ہو
کیونکہ اس کو ہے ہنوز اک مردِ حق کا انتظار

○

۵ اشارات: من رآنی۔ تلمیح ہے حدیثِ مشہور "من رآنی فقد رأ اللہ"
کی طرف یعنی جس نے مجھے دیکھا خدا کو دیکھا۔

۱ دام دام: یعنی پورا کا پورا جال ۲ حدیث مَن رانی فقد رأ اللہ یعنی جس نے مجھے دیکھا، اس نے اللہ کو دیکھ لیا۔

○

بدہ او را جوانِ پاکبازے
سرورش از شرابِ خانہ سازے
قوی بازوئے او مانندِ حیدرؓ
دلِ او از دو گیتی بے نیازے

کر عطا اُمت کو اپنی وہ جوانِ پاک باز
جس کی مستی کا ہو سرچشمہ شرابِ خانہ ساز
اُس کا بازو ہو قوی حیدرؓ کے بازو کی طرح
اور دل بھی اُس کا ہو دونوں جہاں سے بے نیاز

○

بیا ساقی بگرداں جامِ مے را
ز مے سوزندہ تر کن سوزِ نے را
دگر آں دل بنہ در سینۂ من
کہ پیچم پنجۂ کاؤس و کے را

بزم میں آ، اور لا گردش میں ساقی جامِ مے
اور اس مے سے تو پھر سوزندہ تر کر سوزِ نے
میرے سینے میں عطا فرما وہ دل پھر ایک بار
جس کی قوت سے میں توڑوں پنجۂ کاؤس[1] و کے

○

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمیدانم ز جبریلؑ
کہ او یک جوہر از آئینۂ تست

عشق ہے بنیادِ عالم، جو ترے سینے سے ہے
عشق کی مستی تری صہبائے دیرینہ سے ہے
نوریوں میں سب سے برتر ہے مقامِ جبرئیلؑ
اُس کا جوہر بھی ترے ہی نورِ آئینہ سے ہے

[1] کاؤس: نام بادشاہ کا جسے کیکاؤس بھی کہتے ہیں۔ و کے، مخفف کیخسرو کا جو ایک بادشاہِ عجم تھا۔

○

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تست
بتاکم موجِ مے از زمزمِ تست
خجل ملکِ جم از درویشیِ من
کہ دل در سینہٴ من محرمِ تست

سوزِ دل میرا سراسر تیرے فیضِ دم سے ہے
اور میرے تاک[1] میں صہبا تری زمزم سے ہے
مُلکِ جم بھی میری درویشی سے نادم ہوگیا
کیونکہ دل محرم ہے تیرا اور تیرے غم سے ہے

○

دریں بتخانہ دل با کس نہ بستم
ولیکن از مقامِ خود گسستم
ز من امروز می خواہد سجودے
خداوندے کہ دی او را شکستم

دیرِ عالم میں کسی سے دل نہ وابستہ کیا
پھر بھی میں اپنے مقامِ خاص سے نیچے رہا
چاہتا ہے آج وہ باطل خدا مجھ سے سجود
کل جسے میرے ہی ہاتھوں نے کیا محو و فنا

○

دمید آں لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش می تراود از کنارم
قبولش کن ز راہِ دل نوازی
کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

میری مشتِ خاک ہے اس لالہ کی پروردگار
جس کو خونِ ناب دیتا ہے مرا ہی قلبِ زار
ایسے دل کو رد نہ کر، کہتے ہیں تجھ کو دل نواز
ایک دل ہی ہے مرے پاس اے شہِ والا تبار

[1] تاک: انگور کی بیل

بحضورِ ملتِ بیضا تپیدم
نوائے دل گدازے آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گوے
تپیدم، آفریدم، آرمیدم

بزمِ ملت میں رہا ہوں میں سراپا اضطراب
اور نواؤں نے مری ہر قلب کو بخشا شباب
ہے تقاضائے ادب کر دے سخن کو مختصر
کچھ تو تڑپا، کچھ سُنایا اور ہوا پھر مستِ خواب

بصدقِ فطرتِ رندانۂ من
بسوزِ آہِ بیتابانۂ من
بدہ آں خاک را ابرِ بہارے
کہ در آغوش گیرد دانۂ من

یا نبیؐ! میرے ہی صدقِ فطرتِ رندانہ سے
اور سازِ نالہ، سوزِ آہِ بے تابانہ سے
بھیج خاکِ مردۂ مسلم پہ پھر ابرِ بہار
تا بھرے آغوش اپنی میرے ہر ہر دانہ سے

ولے بر کف نہادم دلبرے نیست
متاعے داشتم، غارتگرے نیست
درونِ سینۂ من منزلے گیر
مسلمانے زمن تنہا ترے نیست

دل بہ کف پھرتا ہوں میں لیکن کوئی دلبر نہیں
ساز و ساماں رکھ دیا صحرا میں، غارتگر نہیں
آ کرم کر، اب مرے ہی قلب کو مسکن بنا
دہر میں کوئی ہی مسلم مجھ سے تنہا تر نہیں

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

مثلِ رومی میں نے دی جا کر حرم میں بھی اذاں
اور اُسی کے عشق نے سکھلائے سب اسرارِ جاں
محو اس نے کر دیا تھا فتنۂ عصرِ کہن
اور مٹایا آ کے میں نے فتنۂ عصرِ رواں

گلستانے ز خاکِ من برانگیز
نمِ چشمم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را
نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز

خاک سے میری تو فطرت کے حسیں گلشن اُگا
اور مرے اشکِ مسلسل خونِ لالہ میں ملا
میں اگر تیغِ علیؓ کی شان کے لائق نہیں
تیری شمشیرِ حیدرؓ سی نظر کو کر عطا

مسلماں تا بساحل آرمید است
خجل از بحر و از خود ناامید است
جز ایں مردِ فقیرے دردمندے
جراحت ہائے پنہانش کہ دید است؟

ساحلِ دریا پہ مسلم جب سے ہے راحت پذیر
ہے خجل دریا سے اور خود یاس و حسرت میں اسیر
کوئی کیا جانے کہ باطن اس کا ہے کتنا فگار
دیکھتا ہے زخم اُس کے صرف یہ مردِ فقیر

که گفت او را که آید بوئے یارے؟
که داد او را امیدِ نوبہارے؟
چو آں سوزِ کہن رفت از دمِ او
که زد بر نیستانِ او شرارے؟

کس نے مسلم کو دیا مژدہ کہ آئی بوئے یار
کس نے رکھی اُس کے سینے میں اُمیدِ نوبہار؟
مٹ چکا تھا اِس کے دم سے جبکہ وہ سوزِ کہن
کس نے پھینکا نیستاں میں اُسکے اک تازہ شرار؟

زبحرِ خود بجوئے من گہر دہ
متاعِ من بکوہ و دشت و در دہ
دلم نکشود ازاں طوفاں کہ دادی
مرا شورے ز طوفانے دگر دہ!

میری ندّی میں بھی بھیج اپنے سمندر سے گہر
میرے فیضِ روح سے معمور کر دے دشت و در
تو نے جو طوفاں دیا اُس سے نہیں دل کی کشود
کر بپا سینے میں میرے شورِ طوفانِ دگر

بجلوت نے نوازی ہائے من بیں
بخلوت خود گدازی ہائے من بیں
گرفتم نکتۂ فقر از نیاگاں
ز سلطاں بے نیازی ہائے من بیں

دیکھ میں جلوت[1] میں ہوں کس جوشِ دل سے نغمہ زن
دیکھ میں خلوت میں ہوں کس سوزِ جاں سے خود گداز
جب سے نکتہ فقر کا سمجھا گئے مجھ کو بزرگ
دیکھ! شاہوں سے بھی پاتا ہوں میں خود کو بے نیاز

[1] جلوت: محفل، بزم

○

بہر جائے کہ بودم خوش سرودم
نقاب از روئے ہر معنی کشودم
مپرس از اضطرابِ من کہ با دوست
دمے بودم دمے دیگر نبودم

مَیں رہا جس حال میں سرشارِ نغمہ ہی رہا
چاک ہر پردے کو میں نے روئے معنی سے کیا
دوست کی اُلفت میں تو مت پوچھ میرا اضطراب
ایک دم تھا کہ پاس اُس کے دوسرے دم تھا جُدا

○

شریکِ دردِ سوزِ لالہ بودم
ضمیرِ زندگی را وا نمودم
ندانم با کہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم

میں رہا دائم شریکِ سوز و سازِ لالہ زار
اور کر ڈالا ضمیرِ زندگی کو آشکار
نکتہ ہائے شوق کیا معلوم کس کس نے سُنے
میں تو تنہائی میں تنہا ہی رہا ہوں نغمہ بار

○

بنورِ تو بر افروزم نگہ را
کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم، بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

نور سے تیرے کیا کرتا ہوں میں روشن نگاہ
تاکہ دیکھوں اِس نگہ سے اندرونِ مہر و ماہ
جب یہ کہتا ہوں کہ "مسلم ہوں" لرز جاتا ہے دل
کیونکہ میں ہی جانتا ہوں مشکلاتِ لا اِلٰہ

بکوئے تو گداز یک نوا بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جرأتِ آں رندِ پاکم
خدا را گفت ما را مصطفٰے بس

تیرے کوچہ میں مجھے بس ہے گداز یک نوا
اور کافی ہے مجھے یہ ابتدا، یہ انتہا!
میں تو ایسے رند کی جرأت سے ہوں مست و خراب
جس نے حق سے کہہ دیا "کافی ہے مجھ کو مصطفٰے!"

ز شوق آموختم آں ہاؤ ہوئے
کہ از سنگے کشاید آب جوئے
ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید
ز عشقِ تو بگیرد رنگ و بوئے

شوق سے تیرے ہی سیکھا میں نے شورِ ہاؤ ہو
جو کہ پتھر سے رواں اک دم میں کر دے آبِ جو
ہے یہی اک آرزو تجھ سے کہ جاوید عزیز
عشق سے تیرے ہی پائے زندگی میں رنگ و بو

یکے بنگر فرنگی کج کلاہاں
تو گوئی آفتابانند و ماہاں
جوانِ سادۂ من گرم خون است
نگہدارش ازیں کافر نگاہاں

اک نظر دیکھے اگر تو یہ فرنگی کج کلاہ
تو کہے گا خاک پر نازل ہوئے ہیں مہر و ماہ
گرم خون ہے میری ملت کا جوانِ سادہ لوح
تو ہی دے ان کافروں کے عشق سے اسکو پناہ

بدہ دستے ز پا افتادگاں را
بہ غیرُ اللہ دل ناداگاں را
ازاں آتش کہ جانِ من برافروخت
نصیبے دہ مسلماں زادگاں را

گر رہے ہیں جو، انہیں دے ہاتھ تو امداد کا
گو وہ عاصی ہیں مگر اللہ سے ہیں باوفا
ایسی آتش سے، کہ جس سے جاں مری روشن ہوئی
ایک حصّہ کر مسلمانانِ عالم کو عطا

۱۳

تو ہم آں مے بگیر از ساغرِ دوست
کہ باشی تا ابد اندر برِ دوست
سجودے نیست اے عبدالعزیز[1] ایں
بروبم از مژہ خاکِ درِ دوست

تو بھی ہو محبوب کی مینائے مے سے بہرہ ور
تا رہے تو محفلِ محبوب میں شام و سحر
کون "سجدہ" اس کو کرسکتا ہے اے عبدالعزیز؟
صاف میں مژگاں سے کرتا ہوں نبی کی خاکِ در

تو سلطانِ حجازی من فقیرم
ولے در کشورِ معنی امیرم
جہانے کو ز تخمِ لا الٰہ رست
بیا بنگر با آغوشِ ضمیرم

تو ہے سلطانِ عرب اور میں ہوں اک ادنیٰ فقیر
اس فقیری پر بھی ہوں اقلیمِ معنی کا امیر
جس جہانِ نور کا خالق ہے تخمِ لا الٰہ
دیکھ! ہے موجود اس سے میری آغوشِ ضمیر

[1] سلطان ابن سعود

سراپا درد درماں ناپذیرم
نہ پنداری زبون و زار و پیرم
ہنوزم در کمانے میتواں راند
ز کیشِ ملتے افتادہ تیرم

گو سراپا درد ہوں، اور دردِ درماں ناپذیر
مت سمجھ لیکن کہ ہوں میں ناتواں و زار و پیر
ایسی حالت میں بھی ہو سکتا ہوں میں زیبِ کماں
برق رو ہوں، ترکشِ ملت سے ہوں افتادہ تیر

بیا باہم در آویزیم و رقصیم
ز گیتی دل بر انگیزیم و رقصیم
یکے اندر حریمِ کوچۂ دوست
ز چشماں اشکِ خوں ریزیم و رقصیم

آ کہ باہم مل کے اے ہمدم کریں رقصِ جنوں
آ کہ دل سے محو کر دیں الفتِ دنیائے دوں
آ خدا را آ کہ ناچیں کوچۂ محبوب میں
اور گرائیں آستاں پر اس کے پیہم اشکِ خوں

ترا اندر بیاباں مقام است
کہ شامش چوں سحر آئینہ فام است
بہر جائے کہ خواہی خیمہ گستر
طناب از دیگراں جستن حرام است

تو نے اے حاجی کیا ہے اس بیاباں میں قیام
شام بھی جس کی ہے مانندِ سحر آئینہ فام
جس جگہ چاہے لگا لے خیمۂ دشتِ یار میں
ہے طنابِ غیر کی لیکن طلب اس جا حرام

مسلمانیم و آزاد از مکانیم
بروں از حلقۂ نُہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کز وے
بہائے ہر خداوندے بدانیم

میں ہوں مسلم، دل مرا رہتا ہے آزادِ مکاں
توڑ دیتا ہوں میں دم میں حلقۂ نُہ آسماں
سجدۂ توحید مجھ کو حق نے سکھلایا ہے وہ
ہیچ ہے جس کے مقابل ہر خداوندِ جہاں

ز افرنگی صنم بیگانہ تر شو
کہ پیمانش نمی ارزد بیک جو
نگاہے وام کن از چشمِ فاروق
قدم بے باک نہ در عالمِ نو!

تُو فرنگی بُت کے قدموں پر نہ رکھ اپنی جبیں
قیمت اُس کے عہد کی اک جو برابر بھی نہیں
چشمِ فاروقی سے لے نورِ نگاہِ پُرجلال
پھر قدم بے باک رکھ دُنیا میں با عزم و یقیں

حضورِ ملّت

مجو از من کلامِ عارفانہ
کہ من دارم سرشتِ عاشقانہ
سرشکِ لالہ گوں را اندریں باغ
بیفشانم چو شبنم دانہ دانہ

کر نہ تو مجھ سے طلب ہرگز کلامِ عارفاں
کیونکہ میں رکھتا ہوں فطرت میں سرشتِ عاشقاں
اشکِ لالہ گوں سے میرے تازہ ہے ملّت کا باغ
ہے مری شبنم کا ہر دانہ یہاں قطرہ فشاں

حضورِ ملّت

۱

بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو!

مثلِ ماہِ نو لگا تو اپنی منزل کا پتا
اور اس نیلی فضا میں اپنی ہستی کو بڑھا
دیرِ عالم میں اگر مطلوب ہے اپنا مقام
دِل لگا لے حق سے، رہ پابندِ راہِ مصطفیٰؐ

چو موج از بحرِ خود بالیدہ ام من
بخود مثلِ گہر پیچیدہ ام من
ازاں نمرود با من سرگراں است
بہ تعمیرِ حرم کوشیدہ ام من

موج کی مانند اپنے بحر ہی سے ہوں عیاں
خود ہی میں پیچیدہ گوہر کی طرح ہے میری جاں
میں نے کی ہے مثلِ ابراہیمؑ تعمیرِ حرم
اس لیے رہتا ہے ہر نمرود مجھ سے سرگراں

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را
بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند
کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

آ بھی ساقی اور لا گردش میں اپنا ساتگیں [لہ]
ہر دو عالم تیری صہبا کے مقابل کچھ نہیں
رند پر تو نے کیا ہے فاش رازِ زندگی
کیونکہ مُلّا اور مُفتی نے نہ سمجھی رمزِ دیں

بیا ساقی نقاب از رخ برافگن
چکید از چشمِ من خونِ دلِ من
بہ آں لحنے کہ نے شرقی نہ غربی است
نوائے از مقامِ لَا تَخَفْ زن

آ بھی ساقی اور اُٹھا رخسار سے اپنے نقاب
اب تو میری چشم سے گرتا ہے دل کا خونِ ناب
ایسی لَے میں، مشرق و مغرب میں جو ناپید ہو
"لَا تَخَفْ" [۲ے] کے مقصد و معنی کو کر دے بے حجاب

ے اشارات: لَا تَخَفْ: تلمیح بآیۂ قرآنی، لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔ لے ساتگیں: جام۔ ۲ے خوف مت کھا

برون از سینہ کش تکبیرِ خود را
بخاکِ خویش زن اکسیرِ خود را
خودی را گیر و محکم گیر و خوش زی
مدہ در دستِ کس تقدیرِ خود را

قیدِ سینہ سے رہا کر دے ذرا تکبیرِ خود
آزما اب خاک پر اپنی ہی تو اکسیرِ خود
کر خودی محکم، مسرت سے بسر کر زندگی
مت کسی کے ہاتھ میں نادان دے تقدیرِ خود

مسلماں از خودی مردِ تمام است
بخاکش تا خودی میرد غلام است
اگر خود را متاعِ خویش دانی
نگہ را جز بخود بستن حرام است

ہے خودی ہی سے مسلماں دہر میں مردِ تمام
خاک میں اُس کی خودی مردہ ہے جبتک ہے غلام
فی الحقیقت خود کو گر سمجھو تم اپنی ہی متاع
غیر پر کرنا نظر اپنے سوا سمجھو حرام

مسلماناں کہ خود را فاش دیدند
بہر دریا چو گوہر آرمیدند
اگر از خود رمیدند اندریں دیر
بجانِ تو کہ مرگِ خود خریدند

جن مسلمانوں نے اپنا آپ دیکھا فاش پر
پا گئے راحت وہ ہر دریا میں مانندِ گہر
عظمتِ باطن سے جب کرنے لگے غافل گریز
اپنے ہاتھوں ہی سے کاٹا اپنی ہستی کا شجر

گشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نومید و راہِ مصطفیٰ گیر
اگر باور نداری آنچہ گفتم
ز دیں بگریز و مرگِ کافرے میر!

چہرۂ تقدیر سے پردہ دیا میں نے اُٹھا
ہو نہ اب مایوس اور لے اُٹھ کے رہِ مصطفیٰؐ
گر تجھے آتا نہیں میری نصیحت پر یقیں
دین سے پہلو تہی کر، کافروں کی موت پا!

بہ تُرکاں بستہ درہا را کشادند
بنائے مصریاں محکم نہادند
تو ہم دستے بدامانِ خودی زن
کہ بے او ملک و دیں کس را ندادند

گر دیا ترکوں پہ حق نے بند دروازوں کو وا
مصریوں کی بھی بنائے کار کو محکم کیا
تو بھی دامانِ خودی کو تھام دستِ شوق سے
بن خودی کے ملک و دیں کرتا نہیں خالق عطا

ہر آں قومے کہ می ریزد بہارش
نسازد جز بہ بوہائے رمیدہ
ز خاکش لالہ می روید و لیکن
قبائے دارد از رنگِ پریدہ

ہو خزاں آمادہ اک ملت کی جب شانِ بہار
بُو بھی اُس کے پھول کی کرتی ہے پھر اُس سے فرار
گرچہ اُس کی خاک سے اُگتے ہیں پیہم لالہ زار
اُڑ رہا ہے ہر گھڑی اُن کا بھی رنگِ خوشگوار

○

خدا آں ملتے[1] را سروری داد	ایسی ملت کو عطا اللہ نے کی سروری
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت	جس کی قسمت بھی لکھی تو ہاتھ سے اپنے لکھی
بہ آں ملت سروکارے ندارد	لیکن اُس ملت[2] کے حق میں ہے خدا بھی سرد مہر
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت	جس نے بوئی کشتِ غیراں اور نہ مزدوری ملی

○

ز رازی حکمتِ قرآں بیاموز	معنیٔ قرآں میں رازی سے روشن کر دماغ
چراغے از چراغِ او برافروز	شمع حکمت سے اُسی کی تُو جلا اپنا چراغ
ولے ایں نکتہ را از من فراگیر	باوجود اس کے مرا بھی ایک نکتہ یاد رکھ
کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز	زندگی بھی موت ہے بے اضطراب و سوز و داغ

۲ خودی

کسے کہ بر خودی زد لا الٰہ را	جو خودی میں کر لے پیدا سوز و سازِ لا الٰہ
ز خاکِ مردہ رویاند نگہ را	خاکِ مُردہ سے بھی وہ پیدا کرے گا اک نگاہ
مدہ از دست دامانِ چنیں مرد	مرد جب ایسا ملے، دامن نہ اُس کا چھوڑ تو
کہ دیدم در کمندش مہر و مہ را	کیونکہ اُس کے دام میں دیکھے ہیں میں نے مہر و ماہ

[1] مراد ملتِ سرمایہ داراں [2] مراد ملت مزدوراں

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب — اپنی مشتِ خاک میں ناداں دلِ آگاہ ڈھونڈ
بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب — خود ہی مثلِ بزرگاں آپ اپنی راہ ڈھونڈ
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش — کس طرح مومن کیا کرتا ہے مخفی کو بھی فاش
ز لا موجود در الا اللہ دریاب — بحرِ الا اللہ میں ہو غرق اُس کی تھاہ ڈھونڈ

دلِ تو داغِ پنہانے ندارد — دل تو ہے سینے میں تیرے، ہے مگر محروم داغ
تب و تابِ مسلمانے ندارد — اس نے پایا ہی نہیں ایمان کا کوئی سراغ
خیابانِ خودی را دادۂ آب — تو نے گلزارِ خودی کو آج تک پانی دیا
ازاں دریا کہ طوفانے ندارد — ایسے دریا سے کہ ہے طوفان سے جس کو فراغ

۳ انا الحق

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست — کچھ نہیں رمزِ انا الحق جز مقامِ کبریا
سزائے او چلیپا ہست یا نیست — وصل ہے اُس کی جزا، یا دار ہے اُس کی سزا
اگر فردے بگوید سرزنش بہ — فرد جب کہہ دے "انا الحق" سرزنش اُس کو کرو
اگر قومے بگوید ناروا نیست — قوم جب کہہ دے انا الحق، پھر نہیں یہ ناروا

بہ آں ملت انا الحق سازگار است
کہ از خونش نمِ ہر شاخسار است
نہاں اندر جلالِ او جمالے
کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است

صرف اُس ملت کو ہوتا ہے انا الحق سازگار
خون سے جس کے تر و تازہ ہے اُس کی شاخسار
ہے جمال اُس کا حقیقت میں جلالِ بے پناہ
کیونکہ ہیں نو چرخ اُس کے نور کے آئینہ دار

میانِ اُمتاں والا مقام است
کہ آں اُمت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش
کہ خواب و خستگی بروے حرام است

ہے صفِ اقوامِ عالم میں بہت والا مقام
کیونکہ اُمت ہے محمدؐ کی دو گیتی کی امام
آفرینش[1] کے عمل سے وہ نہیں تھکتا کبھی
خستگی اور خواب ہے اللہ پر یکسر حرام

وجودش شعلہ از سوزِ درون است
چو خس او را جہانِ چند و چون است
کند شرحِ انا الحق ہمت او
پئے ہر کُن کہ می گوید یکون است

شعلہ کر دیتا ہے اُس کے جسم کو سوزِ دروں
خار و خس اُس کی نظر میں ہے جہانِ چند و چوں
مردِ مومن ہی اُٹھاتا ہے "انا الحق" سے حجاب
اُس کے ہر "کُن"[2] کا نتیجہ بالیقیں ہوگا "یکوں"[3]

۱؎ حاشیہ صفحہ ۷۸ پر ۲؎ ۳؎ حاشیہ صفحہ ۷۸ پر

○

پر دروسعتِ گردوں یگانہ	چرخ پر پرواز مومن کی یگانہ ہی رہی
نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ	اور نظر بھی اُس کی سوئے آشیانہ ہی رہی
مہ و انجم گرفتارِ کمندش	ماہ و انجم کو رکھا اُس نے گرفتارِ کمند
بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ	ہاتھ میں مومن کے تقدیرِ زمانہ ہی رہی

○

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے	باغ میں مومن ہے گویا عندلیب خوش صفیر
براغاں جرّہ بازے زودگیرے	راغ[1] میں لیکن ہے وہ مانندِ شاہیں زودگیر[2]
امیرِ او بسلطانی فقیرے	پادشاہی میں بھی قائد اُس کا رہتا ہے فقیر
فقیرِ او بہ درویشی امیرے	اور اُس کا فقر درویشی میں ہے رشکِ امیر

---

۱ راغ : جنگل ۲ زودگیر : جلد پکڑنے والا

حاشیہ صـ۲۲ ۵ اشارات: خواب: تلمیح بآیۂ قرآنی : لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ

خستگی: تلمیح بآیۂ قرآنی : وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۵

۱ آفرینش: پیدائش ۲ کُن : ہو جا ۳ یکون: پس وہ ہو گیا

بجامِ نو کہن مے از سبو ریز
فروغِ خویش را بر کاخ و کو ریز
اگر خواہی ثمر از شاخِ منصور
بہ دل لا غالبَ الّا اللہ فرو ریز

جامِ نَو میں ڈال دے کہنہ شرابِ مُشک بو
نور سے اپنے منور کر دے پھر یہ کاخ و کو
چاہتا ہے گر ثمر تو شاخ سے منصورؒ کی
دل میں اپنے نقش کر لے معنیٔ "اللہ ھُو"

۴ صوفی و مُلّا

گرفتم حضرتِ مُلّا ترش روست
نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم
مرا از کعبہ می راند حقِ اوست

تلخ گوئی سے ہے مُلّا کی سبھی کا دل گداز
پوست کا وہ مغز سے کرتا نہیں کچھ امتیاز
یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے جیسا اگر مومن ہوں میں
مجھ کو کعبہ سے اُٹھا دینے کا ہے مُلّا مجاز

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر
صدا از خانقاہاں رفت "لاغیر"
حکایت پیشِ مُلّا باز گفتم
دُعا فرمود یا رب عاقبت خیر!

کعبہ و بُت خانہ بھی صیدِ فرنگی ہو گیا
ذکرِ حق کی خانقاہوں سے نہیں اُٹھتی صدا
جب شکایت پیشِ مُلّا کی، لگا کرنے دُعا
یا الٰہی! خاتمہ بالخیر ہو اس شخص کا

به بندِ صوفی و مُلا اسیری
حیات از حکمتِ قرآں نگیری
به آیاتش ترا کارے جز ایں نیست
که از یٰسینِ او آساں بمیری

تو نہ ہرگز ہو سکا قرآں سے حکمت پذیر
صوفی و مُلا کے پھندوں میں رہا دائم اسیر
تجھ کو یہ مطلب ہے بس قرآن کی آیات سے
جب پڑھے "یٰسین" تو آساں مریں برنا و پیر

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز
دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوے بنه کردارِ خود را
قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

دیکھ اپنے خال و خد، قرآں کو آئینہ بنا
ہو چکا ہے مسخ تو اپنے سے فوراً دور جا
لے ترازو عشق کا، تول اُس میں پھر اپنے عمل
جو صحابہؓ نے اُٹھائے، تو بھی وہ محشر اُٹھا

ز من بر صوفی و مُلا سلامے
که پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

صُوفی و مُلا کو میں آداب لاتا ہوں بجا
کیوں کہ دونوں نے پیام اللہ ہم کو دیا
الاماں! اِن کی مگر آیات کی تاویل سے
محوِ حیرت ہیں خدا اور جبرئیل و مصطفیٰ

زِ دوزخ واعظِ کافرگرے گفت
حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
نداند آں غلام احوالِ خود را
کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

حرفِ دوزخ ہیں سُناتے واعظینِ کفرگر
بات کافر نے کہی ہے اُن سے بھی اک خُوب تر
جس نے دوزخ کو بتایا کافروں ہی کا مقام
وہ غلام اپنی ہی فطرت سے ہے ابتک بے خبر

مریدے خود شناسے پختہ کارے
بہ پیرے گفت حرفِ نیش دارے
بمرگِ ناتمامے جاں سپردن
گرفتن روزی از خاکِ مزارے

ایک محفل میں مُرید خود شناس و پختہ کار
پیر سے کہنے لگا یہ حرفِ تیز و نیش دار
اُس پہ طاری ہر گھڑی رہتی ہے مرگِ ناتمام
جو بزرگوں کی بھی بیچے بیٹھ کر خاکِ مزار

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے
ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرد
بہ نمرودانِ ایں دور آشنا باش
ز فیضِ شاں براہیمی تواں کرد

ایک دن کہنے لگا بیٹے سے اک مردِ خسیس
سُن یہ نکتہ اور بنا ہستی کی تُو اِس کو دلیل[۱]
عصرِ حاضر کے جو ہیں نمرود، اُن سے مل چلا
فیض سے اُن کے ادا کر پائیگا فرضِ خلیل[۲]

۱؎ دلیل: بمعنی راہ نما۔

٥ رومی

بکامم خود دگر آں کہنہ مے ریز
کہ با جامش نیرزد ملکِ پرویز
ز اشعارِ جلال الدین رومی
بہ دیوارِ حریمِ دل بیاویز

پی لے پھر مے خانۂ رومی سے وہ کہنہ شراب
سامنے اس جام کے ہے ملک جم بھی اک حباب
پھر حریم قلب کو اشعار رومی سے سجا
اور پیدا کر تنِ مردہ میں پھر روحِ شباب

○

بگیر از ساغرش آں لالہ رنگے
کہ تاثیرش دہد لعلے بہ سنگے
غزالے را دلِ شیرے بہ بخشد
بشوید داغ از پشتِ پلنگے

ساغرِ رومی سے پی لے پھر شراب لالہ رنگ
اس کے اعجاز و اثر سے لعل ہو جاتا ہے سنگ
یہ ہرن کو بھی عطا کرتی ہے شیروں کا جگر
اور دھو دیتی ہے یکسر داغ سے پشتِ پلنگ

○

نصیبے بردم از تاب و تبِ او
شبم مانندِ روز از کوکبِ او
غزالے در بیابانِ حرم بین
کہ ریزد خندۂ شیر از لبِ او

اُس کے سوز و ساز سے میں نے بھی اک حصہ لیا
میری شب نے اُس کے کوکب ہی سے پائی ہے ضیا
دیکھ صحرائے حرم میں تو ذرا حالِ غزال
اُس کے ہونٹوں سے ہوا گلریز خندہ شیر کا

سراپا درد و سوز آشنائی
وصالِ او زبان دانِ جدائی
جمالِ عشق گیرد از نَے او
نصیبے از جلالِ کبریائی

خود ہی رومی درد و سوزِ آشنائی ہو گیا
وصل بھی اُس کا زبان دانِ جدائی ہو گیا
فیض پایا اُس کی نَے سے جب جمالِ عشق نے
وہ سراپا اک جلالِ کبریائی ہو گیا

گرہ از کارِ ایں ناکارہ وا کرد
غبارِ رہ گذر را کیمیا کرد
نئے آں نے نوازے پاکبازے
مرا با عشق و مستی آشنا کرد

مجھ سے ناکارہ کے عقدوں کو کیا ہے اُس نے وا
اور کر ڈالا غبارِ رہ گزر کو کیمیا
ایک رومی ہے وہ مردِ نے نواز و پاکباز
عشق و مستی سے کیا ہے جس نے مجھ کو آشنا

بروئے من درِ دل باز کردند
ز خاکِ من جہانے ساز کردند
ز فیضِ او گرفتم اعتبارے
کہ با من ماہ و انجم ساز کردند

دست رومی نے کیا ہے دل کے دروازے کو باز
خاک سے میری ہوا پیدا جہانِ سوز و ساز
فیض سے اُس کے مجھے حاصل ہوا ہے یہ مقام
انجم و خورشید و مہ کے ساتھ پڑھتا ہوں نماز

خیالش با مہ و انجم نشیند
نگاہش آں سوئے پرویں بہ بیند
دلِ بیتابِ خود را پیشِ او نہ
دم او رعشہ از سیماب چیند

ہے خیال اُس کا مہ و انجم سے دائم ہم نشیں
ماوراپرویں سے ہے اُس کی نگاہِ دُوربیں
سامنے رُومی کے تو اپنا دلِ بے تاب رکھ
وہ کرے دم جس پہ اُس سیماب میں رعشہ نہیں

ز رومی گیر اسرارِ فقیری
کہ آں فقر است محسودِ امیری
حذر زاں فقر و درویشی کہ از وے
رسیدی بر مقامِ سربزیری

سیکھ درویشی سے رومی کی تو اسرارِ فقیر
کیونکہ اُس کا فقر ہے محسودِ ہر میر و وزیر
الحذر، اُس فقر و رہبانی سے ہر دم الحذر
کر دیا جس نے تجھے طوقِ غلامی میں اسیر

خودی تا گشت مہجورِ خدائی
بہ فقر آموخت آدابِ گدائی
ز چشمِ مستِ رومی وام کردم
سرورے از مقامِ کبریائی

ہو گئی جب سے خودی انساں کی مہجورِ خدا
فقر کو اُس نے سکھا ڈالے ہیں آدابِ گدا
میں نے رومی ہی کی چشمِ مست سے حاصل کیا
جو زبانِ دل میں ہے سوز و سرورِ کبریا

مئے روشن ز تاکِ من فرو ریخت — تاک سے میرے مئے روشن سدا گرتی رہی
خوشا مردے کہ در دامانم آویخت — مرد خوش قسمت ہی جس نے کی ہی میری پیروی
نصیب از آتشے دارم کہ اول — میں تو ایسی تیز و تند آتش سے رکھتا ہوں نصیب
سنائی از دلِ رومی برانگیخت — جو سنائی نے بپا آخر دلِ رومی سے کی

۶ پیامِ فاروق رضؓ

تو اے بادِ بیاباں از عرب خیز — تو عرب کے دشت سے طوفاں بپا کر اے ہوا
ز نیلِ مصریاں موجے برانگیز — مصریوں کے نیل سے پھر موجِ محشر زا اٹھا
بگو فاروق را پیغامِ فاروقؓ — جا کے کہہ فاروق سے پیغام یہ فاروقؓ کا
کہ خود در فقر و سلطانی بیامیز — ذات میں اپنی تو شاہی اور فقیری کو ملا

خلافت، فقر با تاج و سریر است — کیا ہے مفہوم خلافت؟ فقر با تاج و سریر[1]
زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است — سب سے بہتر ہے وہ دولت جو ہے پایاں ناپذیر[2]
جواں بختا! مدہ از دست ایں فقر — اے جواں! اس فقر کو تو ہاتھ سے ہرگز نہ دے
کہ بے او پادشاہی زود میر است — جب نہ ہو یہ فقر تو ہے پادشاہی زود میر

لہ ٹہ حاشیہ صفحہ ۸۵

جواں مردے کہ خود را فاش بیند
جہانِ کہنہ را باز آفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش
کہ او با خویشتن خلوت گزیند

دیکھتا ہے فاش اپنے کو جب اک مردِ جواں
از سرِ نو ہے بناتا توڑ کر کہنہ جہاں
جب وہ ہو جاتا ہے اپنے آپ میں خلوت گزیں
انجمن ہر دم نئی گردِ اُس کے ہوتی ہے عیاں

بہ روئے عقل و دل بکشائے ہر در
بگیر از پیرِ ہر میخانہ ساغر
دراں کوش از نیازِ سینہ پرور
کہ دامن پاک داری آستیں تر

عقل و دل پر کھول دے ہر حکمتِ عالم کا در
لے تو ہر پیرِ مغاں سے ساغرِ دانش اثر
چشم میں سینے سے لا تنے اُٹھا کر تو گہر
پاک ہو دامن[۱] ترا اور آستیں[۲] تیری ہو تر

حاشیہ صہ ۸۵ ۱؎ سریر: تخت ۲؎ پایاں ناپذیر: ختم نہ ہونیوالی

۵؎ اشارات: دراں کوش (۴) حضرت امیر خسرو کا شعر ہے۔

۱؎ پاکدامن ہونا محاورہ ہے بے گناہ ہونے کے مفہوم میں

۲؎ آستیں تر: یعنی خدا کے حضور اشک ندامت سے

خنک آں ملّتے بر خود رسیدہ
ز دردِ جستجو نا آرمیدہ
درخشِ او تہِ ایں نیلگوں چرخ
چو تیغے از میاں بیروں کشیدہ

خوب ہے وہ قوم جس نے پا لیا اپنا مقام
اور دردِ جستجو سے جس پہ راحت ہے حرام
یوں مجلّی ہے وہ ملّت زیرِ چرخِ نیلگوں
جیسے رخشاں ہو شعاعِ خُور میں تیغِ بے نیام

چہ خوش زد تُرکِ ملّاحے سرودے
رخِ او احمرے چشمش کبودے
بدریا گر گرہ افتد بہ کارم
بجز طوفاں نمی خواہم کشودے

کیف میں اک ناخدائے تُرک تھا محوِ سرود
رُخ تھا اُس کا لالہ گوں اور چشم تھی اس کی کبود
گر کبھی دریا میں عقدہ آ پڑے کوئی مجھے
میں تو چاہوں گا فقط طوفان سے اُس کی کشود

جہانگیری بخاکِ ما سرشتند
امامت در جبینِ ما نوشتند
درونِ خویش بنگر آں جہاں را
کہ تخمش در دلِ فاروقؓ کشتند

ہے ازل ہی سے جہانگیری کی حامل میری خاک
اور امامت کی رقم ہے یہ جبینِ تابناک
دیکھ تو سینے میں اپنے وہ جہانِ پُرشکوہ
تھا دلِ فاروقؓ میں مستور جس کا تخمِ پاک

کسے کو داند اسرارِ یقین را	نورِ دل سے پالئے جس نے بھی اسرارِ یقین
یکے بیں می کند چشم دوبین را	آخرش یک بیں ہوئی اُس مرد کی چشمِ دوبیں
بیامیزند چوں نورِ دو قندیل	جس طرح ملتی ہے باہم دو چراغوں کی ضیا
ببیندش افتراقِ ملک و دیں را	اس طرح مربوط سمجھو تم نظامِ ملک و دیں

مسلمانے کہ خود را امتحاں کرد	جس مسلماں نے کیا اپنا ہی پیہم امتحاں
غبارِ راہِ خود را آسماں کرد	وہ بنا دے گا غبارِ راہ کو بھی آسماں
شرارِ شوق اگر داری نگہدار	ہے شرارِ عشق گر دل میں ترے، محفوظ رکھ
کہ با وے آفتابی می تواں کرد	یہ شرر بن جائے گا اک آفتابِ ضو فشاں

۷ شعرائے عرب

بگو از من نواخوانِ عرب را	دو مرا پیغام جا کر، اے نواخوانِ عرب
بہائے کم نہادم لعلِ لب را	نزد میرے ہیچ و بے قیمت ہے تیرا لعلِ لب
ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم	نورِ قرآں نے دیا جب سے مرے دل کو فروغ
سحر کردم صد و سی سالہ شب را	صبح میں بدلی ہے میں نے ہی صد و سی سالہ شب

بجانہا آفریدم ہائے و ہو را
کفِ خاکے شمردم کاخ و کو را
شود روزے حریفِ بحرِ پر شور
ز آشوبے کہ دادم آبِ جو را

میں نے ہی برپا کیا روحوں میں شور ہائے و ہو
مَیں نے مشتِ خاک سمجھے ہیں جہاں کے کاخ و کو
اک نہ اک دِن بحر کی ہو کر رہے گی وہ حریف
میرے ہنگاموں سے ہے معمور جو بھی آبِ جو

تو ہم بگزار آں صورت نگاری
بجو عزّ از ضمیرِ خویش یاری
بباغِ ما بر آوردی پر و بال
مسلماں را بدہ سوزے کہ داری

حُسنِ معنی پر نظر کر، بن نہ تو صورت نگار
صرف اپنے قلب ہی کو جان اپنا یارِ غار
گلشنِ ملّت میں جب تجھ نے نکالے بال و پر
سوز و سازِ نغمہ سے مسلم کے دِل کو بھی اُبھار

بخاکِ ما دلے، در دل غمے ہست
ہنوز ایں کہنہ شاخے را نمے ہست
بہ افسونِ ہنر آں چشمہ بکشائے
درونِ ہر مسلماں زمزمے ہست

ہے ہماری خاک میں دل اور دل میں غم بھی ہے
گو ہے شاخِ باغ کہنہ، لیکن اس میں نم بھی ہے
اب تو اعجازِ ہنر سے اُس کا منبع کھول دے
سینۂ مسلم میں پنہاں چشمۂ زمزم بھی ہے

مسلماں بندۂ مولا صفات است
دلِ او سرّے از اسرارِ ذات است
جمالش جز بہ نورِ حق نہ بینی
کہ اصلش در ضمیرِ کائنات است

ہے مسلماں درحقیقت بندۂ مولا صفات
دل میں اُس کے مرتکز ہیں ہر گھڑی اسرارِ ذات
غیرِ نورِ حق نہ دیکھے گا تو مومن کا جمال
کیونکہ اس کا حُسن ہے روح و روانِ کائنات

بدہ با خاکِ او آں سوز و تابے
کہ زاید از شبِ او آفتابے
نوا آں زن کہ از فیضِ تو او را
دگر بخشند ذوقِ انقلابے

خاکِ مسلم کو عطا فرما دے پھر وہ سوز و تاب
تاکہ اُس کی ظلمتِ شب سے ہو پیدا آفتاب
سینۂ پُرجوش سے اپنے بپا کر وہ نوا
قلبِ مومن میں ہو پیدا جس سے ذوقِ انقلاب

مسلمانی غمِ دل در خریدن
چو سیماب از تپِ یاراں تپیدن
حضورِ ملّت از خود در گذشتن
دگر بانگِ اَنا المِلّت کشیدن

ہے مسلمانی خریدِ درد و سوزِ قلب و جاں
اور غمِ یاراں میں رہنا پارے کی صورت تپاں
بھول جانا انفرادی زندگی کو پیشِ قوم
اور اَنا المِلّت[1] کی دنیا ہر دو عالم میں اذاں

[1] اَنا المِلّت: میں ایک قوم ہوں

کسے کو فاش دید اسرارِ جاں را
نہ بیند جز بچشمِ خود جہاں را
نوائے آفریں در سینۂ خویش
بہارے میتواں کردن خزاں را

پالئے ہیں زندگی میں جس نے بھی اسرارِ جاں
دیکھتا ہے چشم سے اپنی ہی وہ روحِ جہاں
کر بپا سینے سے اب وہ نغمۂ جاں آفریں
جو خزاں کو بھی بنا تاہے بہارِ جاوداں

نگہدار آں چہ در آب و گلِ تست
سرور و سوز و مستی حاصلِ تست
تہی دیدم سبوئے این و آں را
مئے باقی بہ مینائے دلِ تست

جوہرِ ایماں ہے تن میں حفظ کے قابل ترا
ہے سرور و سوز و مستی دہر میں حاصل ترا
میں نے دیکھے بزمِ عالم میں تہی سب کے سبو
ہے مئے باقی سے روشن صرف جامِ دل ترا

شب ایں کوہ و دشتِ سینہ تابے
نہ در وے مرغکے نے موجِ آبے
نگردد روشن از قندیلِ رہباں
تو میدانی کہ باید آفتابے

چھا رہی ہے جو شبِ کہسار و دشتِ سینہ تاب
اس میں کوئی مرغ پیدا ہے نہ ہی اک موجِ آب
یہ کبھی روشن نہ ہوگی پر تو قندیل سے
چاہیے ایسی شبِ تیرہ کو نورِ آفتاب

نکو میخواں خطِ سیمائے خود را
غور سے پڑھ لے تو اے غافل خطِ سیمائے[1] خود

بدست آور رگِ فردائے خود را
ہاتھ میں پھر تھام لے غور آر رگِ فردائے خود

چو من پا در بیابانِ حرم نہ
تو بھی اب میری طرح دشتِ حرم میں رکھ قدم

کہ بینی اندرو پہنائے خود را
تاکہ ہر ذرّے میں اُس کے دیکھ لے پہنائے[2] خود

۸ اے فرزندِ صحرا

سحر گاہاں کہ روشن شد در و دشت
صبح دم جب دشت و در پر چھا گیا نورِ جمیل

صدا زد مرغے از شاخِ نخیلے
دے رہا تھا یہ صدا اک طائرِ شاخِ نخیل

فرو ہل خیمہ اے فرزندِ صحرا
چھوڑ کر خیمے کو اے فرزندِ صحرا کر سفر

کہ نتواں زیست بے ذوقِ رحیلے
زندگی ممکن نہیں دنیا میں بے ذوقِ رحیل[3]

عرب را حق دلیلے کارواں کرد
کر دیا حق نے عرب کو رہنمائے کارواں

کہ او با فقر خود را امتحاں کرد
کیونکہ اُس نے فقر سے اپنے کئے ہیں امتحاں

کہ اگر فقرِ تہی دستاں غیور است
ہو اگر فقرِ تہی دستاں بھی خوددار و غیور

جہانے را تہ و بالا تواں کرد
وہ تہ و بالا کریں اک لمحہ میں سارا جہاں

---

[1] سیما: پیشانی۔ [2] پہنا: وسعت [3] رحیل: کوچ

در آں شب ہا خروشِ صبح فرداست
کہ روشن از تجلی ہائے سیناست
تن و جاں محکم از بادِ در و دشت
طلوعِ اُمتاں از کوہ و صحراست

ایسی شب سے بھی خروشِ صبح فردا ہے بپا
طورِ سینا کی تجلی سے جو پاتی ہے ضیا
جسم و جاں ہیں فرد کے محکم ہوئے دشت سے
کیونکہ قوموں کا جنم ہی کوہ و صحرا سے ہوا

۹ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دگر آئینِ تسلیم و رضا گیر
طریقِ صدق و اخلاص و وفا گیر
مگو شعرم چنین است و چناں نیست
جنونِ زیرکے از من فرا گیر

اے مسلماں! سیکھ پھر آئینِ تسلیم و رضا
اور عمل میں لا طریقِ صدق و اخلاص و وفا
کہہ نہ ہرگز شعر ایسا ہے ترا، ویسا نہیں
وہ جنوں دیتا ہوں تجھکو جو کہ ہے حکمت فزا

چمن ہا زاں جنوں ویرانہ گردد
کہ از ہنگامہ ہا بیگانہ گردد
ازاں ہوئے کہ افگندم دریں شہر
جنوں ماند و لے فرزانہ گردد

جو جنوں ہنگامۂ محفل سے بیگانہ ہوا
اُس جنوں سے ہر چمن دنیا کا ویرانہ ہوا
دشتِ عالم میں بپا کی میں نے جو آوازِ ھُو
آخرش مجنوں بھی اُس سے مردِ فرزانہ ہوا

نخستیں لالۂ صبحِ بہارم
پیاپے سوزم از داغے کہ دارم
بچشمِ کم مبیں تنہائیم را
کہ من صد کارواں گل در کنارم

اِس چمن میں ہوں مَیں پہلا لالۂ صبحِ بہار
سوز دیتا ہے دمادم مجھ کو قلبِ داغ دار
میری تنہائی کو اے نادان نفرت سے نہ دیکھ
روزِ اوّل سے ہوں میں صد کارواں گل در کنار

پریشانم چو گردِ رہ گذارے
کہ بر دوشِ ہوا گیرد قرارے
خوشا بختے و خرّم روزگارے
کہ بیروں آید از من شہسوارے

میں پریشاں ہی رہا مانندِ گردِ رہ گذار
تا ہوا کے دوش پر ہو جاگزیں میرا غبار
کس قدر ہے خرّم و خوش بخت ایسا روزگار
جس میں میری گرد سے پیدا ہو مردِ شہسوار

خوش آں قومے پریشاں روزگارے
کہ زاید از ضمیرش پختہ کارے
نمودش سرّے از اسرارِ غیب است
ز ہر گردے بروں ناید سوارے

ہے بہت خوش بخت وہ قومِ پریشاں روزگار
قلب سے جس کے ہو پیدا ایک مردِ پختہ کار
ہے رموزِ غیب سے اک رمز ہی اُس کا وجود
کیونکہ ہر اک گرد سے ظاہر نہیں ہوتا سوار

به بحرِ خویش چوں موجے تپیدم
تپیدم تا بطوفانے رسیدم
دگر رنگے ازیں خوشتر ندیدم
بخونِ خویش تصویرش کشیدم

بحر میں اپنے میں مضطر موج کی صورت رہا
اس کشاکش نے مجھے قطرے سے طوفاں کر دیا
بحر سے بہتر نہ پایا زندگی میں کوئی رنگ
میں نے خونِ قلب سے پیکر بنایا یار کا

نگاہش پر کند خالی سبوہا
دواند مے بتاک آرزوہا
ز طوفانے کہ بخشد رائگانی
حریفِ بحر گردد آب جوہا

پُر ہوئے اکثر نگاہِ یار سے خالی سبو
اُس کی صہبا سے بھرا رہتا ہے تاکِ[1] آرزو
بذل[2] اُس کا جب عطا کرتا ہے اک طوفانِ آب
بحر سے ٹکرانے کو اُٹھتی ہے موجِ آبِ جو

چو بر گیرد زمامِ کارواں را
دہد ذوقِ تجلی بر نہاں را
کند افلاکیاں را آنچناں فاش
تہِ پا می کشد نُہ آسماں را

مردِ مومن ہاتھ میں لے جب زمامِ کارواں
روشنی کے ذوق سے ہوتا ہے ظاہر ہر نہاں
فاش کرتا ہے وہ اہلِ چرخ کو اس شان سے
اُس کے زیرِ پا بچھے رہتے ہیں ساتوں آسماں

[1] تاک: انگور کی بیل۔ [2] بذل: سخاوت

○

مبارکباد کن آں پاک جاں را
کہ زاید آں امیرِ کارواں را
ز آغوشِ چنیں فرخندہ مادر
خجالت می دہم حورِ جناں را

سو مبارکباد کے قابل ہے وہ پاکیزہ جاں
بطن سے جس کے ہو پیدا وہ امیرِ کارواں
ایسی مادر کی تو ہے آغوش بھی اتنی حسیں
ایک ہی جلوے سے جس کے ہو خجل حورِ جناں

○

دل اندر سینہ گوید دلبرے ہست
متاعے آفریں غارتگرے ہست
بگوشم آمد از گردوں دم مرگ
شگوفہ چوں فرو ریزد برے ہست[1]

سینے میں دل کہہ رہا ہے قلب میں دلبر تو ہے
تو کوئی سامان لا، صحرا میں غارتگر تو ہے
یہ صدا آئی ہے کانوں میں ہمدم وقتِ موت
جب شگوفہ گر پڑے مٹی میں، وہ بھی بر تو ہے

۱۰ خلافت و ملوکیت

عرب خود را بہ نورِ مصطفیٰ سوخت
چراغِ مردۂ مشرق برافروخت
ولیکن آں خلافت راہ گم کرد
کہ اول مومناں را شاہی آموخت

خود عرب نورِ نبیؐ سے ہو گیا جب پُر ضیا
اُس نے مشرق کے چراغِ مردہ کو روشن کیا
ہو گئی گم دہر سے لیکن خلافت کی وہ راہ
جس نے پہلے مومنوں کو درسِ شاہی تھا دیا

[1] بر: پھل۔ اس شعر میں حیات بعد الممات کا اثبات کیا گیا ہے۔
اشارات۔ [illegible]

خلافت بر مقامِ ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

عظمتِ مومن پہ شاہد ہے خلافت کا نظام
پادشاہی، دینِ فطرت میں ہوئی مطلق حرام
ہے ملوکیت سراسر پیکرِ مکر و فریب
اور خلافت حکم و ناموسِ الٰہی کا قیام

در افتد با ملوکیت کلیمے
فقیرے بے کلاہے بے گلیمے
گہے باشد کہ بازی ہائے تقدیر
بگیرد کارِ صرصر از نسیمے

بادشاہوں سے بھی ٹکراتا ہے گاہے اک کلیم
بے تفنگ و بے کلاہ و بے رفیق و بے گلیم
یوں بھی ہوتا ہے کہ اکثر کھیل میں تقدیر کے
کام طوفانوں کا دے جاتی ہے اک موجِ نسیم

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

ہے ابھی تک اس جہاں میں آدمی زادہ غلام
خام ہے اس کا نظام اور کام اس کا ناتمام
میں تو بندہ ہوں سراسر اس نبی کے فقر کا
دین میں جس کے ملوکیت ہوئی مطلق حرام

محبت از نگاہش پایدار است
اُس نبیؐ ہی کی نگاہوں سے ہے الفت پائدار
سلوکش عشق و مستی را عیار است
جس کا مسلک ہو چکا ہے عشق و مستی کا عیار
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
ہے شریعت میں اگرچہ "عبدہٗ" اُس کا مقام
جہانِ شوق را پروردگار است
قلب اُس کا ہے جہانِ شوق کا پروردگار

۱۱ ترک عثمانی

بملکِ خویش عثمانی امیر است
گرچہ اپنے ملک میں ہے ترک خوش حال و امیر
دلش آگاہ و چشم او بصیر است
قلب ہے آگاہ اُس کا، چشم ہے اُس کی بصیر
نہ پنداری کہ رست از بندِ افرنگ
مت سمجھ لیکن کہ ہے آزاد وہ افرنگ سے
ہنوز اندر طلسمِ او اسیر است
ہے ابھی تک وہ فرنگی ہی کے جادو میں اسیر

خنک مرداں کہ سحرِ او شکستند
مرد ہے، جس نے کیا ہے سحر کو اُس کے فنا
بہ پیمانِ فرنگی دل نہ بستند
اور دل عہدِ فرنگی سے نہ وابستہ کیا
مشو نومید و باخود آشنا باش
اپنی عظمت کو سمجھ، رحمت سے ہو مت نا اُمید
کہ مرداں پیش ازیں بودند و ہستند
مرد تھے پہلے، ہیں بھی اور موجود ہے اُن کی بقا

به ترکاں آرزوئے تازہ دادند — ملتِ ترکی نے پایا حق سے ایسا انقلاب
بنائے کارِ شاں دیگر نہادند — آرزوئے تازہ سے وہ ہو چکی ہے فیض یاب
ولیکن کو مسلمانے کہ بیند — چشمِ مسلم! دیکھ اس طوفان کی تہ میں ہے کیا
نقاب از روئے تقدیرے کشادند — چہرۂ تقدیر سے فطرت نے الٹی ہے نقاب

۱۲ دخترانِ ملت

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا — چھوڑ اے دختر تصنع کا طریقِ دلبری
مسلماں را نہ زیبد کافری ہا — لائق مسلم نہیں ہے یہ نظام کافری
منہ دل بر جمالِ غازہ پرورد — سرخی و غازہ پہ شیدا ہو نہ اے عصمت کی روح
بیاموز از نگہ غارت گری ہا — سیکھ اب اپنی نگہ سے کفر کی غارت گری

نگاہِ تست شمشیرِ خدا داد — تو اگر سمجھے نگہ [illegible] شمشیرِ خدا
بزخمش جانِ ما را حق بما داد — زخم سے جس کے ہمیں [illegible] حاصل ہوا
دلِ کامل عیار آں پاک جاں سو — دل ترا جب پاک ہو [illegible] بھی ہر اک
کہ تیغِ خویش را آب از حیا داد — پس حیا سے تیغِ عصمت کو عطا کر دے جلا

ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است
کشادش در نمودِ رنگ و آب است
جہانتابی ز نورِ حق بیاموز
کہ او با صد تجلّی در حجاب است

عصرِ حاضر کا ضمیر پرفتن ہے بے نقاب
اس کی آرائش کا سامانِ جلا ہے رنگ و آب
نورِ حق سے سیکھ لے دختر جہاں تابی کا راز
چار سو ہیں اُس سے روشن خود ہے وہ زیرِ حجاب

جہاں را محکمی از اُمّہات است
نہادِ شاں امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند
نظامِ کاروبارش بے ثبات است

ہیں نظامِ دہر کی قوّت کا باعث اُمّہات
اُن کی ہستی سے نمایاں ہیں عمل کی ممکنات
قوم جو بھی عظمتِ نسواں سے ہوگی بے خبر
کاروبارِ زندگانی اُس کا ہوگا بے ثبات

مرادا ایں خرد پرور جنونے
نگاہِ مادرِ پاک اندرونے
ز مکتب چشم و دل نتواں گرفتن
کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے

حق نے میری ماں کا روشن کر دیا تھا اندروں
دے گئی مجھ کو نظر سے یہ خرد پرور جنوں
قلبِ زندہ، چشمِ بینا کر نہ مکتب میں تلاش
مدرسے میں کچھ نہ پائے گا تو جز سحر و فسوں

خنک آں ملتے کز وارداتش
قیامت ہا بہ بیند کائناتش
چہ پیش آید چہ پیش افتاد او را
تواں دید از جبینِ امہاتش

زندہ ہے وہ قوم جس میں زن کا دستورِ حیات
دین و آئیں کو عطا کرتا ہے اک روحِ ثبات
حال ہو ماضی ہو یا اندازِ استقبال ہو
سب کی کیفیت ہے منقوشِ جبینِ امہات

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرؓ بگیری

بندۂ درویش کی اک پند اگر کر لے قبول
غیر فانی ہو گی تو ہرگز نہ ہو گا دل ملول
عصرِ حاضر کی نگاہِ پُر ہوس سے دور رہ
پائے تا شبیرؓ سا فرزند تو مثلِ بتولؓ

ز شامِ ما بروں آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو میدانی کہ سوزِ قراءتِ تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را[1]

کر ہماری شام سے تخلیق پھر نورِ سحر
اس طرح قرآں پڑھ رونے لگیں اہلِ نظر
آہ اے ناداں تجھے معلوم کیا اپنا مقام
تیری قراءت نے بدل ڈالی تھی تقدیرِ عمرؓ[2]

[1] اشارات: حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ [2] حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کی طرف اشارہ ہے۔

۱۳ عصرِ حاضر

چہ عصر است ایں کہ دیں فریادی اوست
ہزاراں بند در آزادیٔ اوست
ز روئے آدمیت رنگ و نم برد
غلط نقشے کہ از بہزادیٔ اوست

عصرِ حاضر کے عمل سے دیں ہوا ہے نوحہ خواں
اس کی آزادی میں بھی قید و غلامی ہے نہاں
نقشِ باطل جو بنایا ہے یہاں بہزاد نے
رنگ و بوئے آدمیت کا نہیں اس میں نشاں

نگاہش نقشبندِ کافری ہا
کمالِ صنعتِ او آذری ہا
حذر از حلقۂ بازارگانش
قمار است ایں ہمہ سوداگری ہا

ہے نگاہِ عصرِ حاضر نقشبندِ کافری
اور کمالِ صنعتِ موجود نقشِ آذری
الحذر اس دور کے سوداگروں سے الحذر
اک جوا ہے درحقیقت اُن کی یہ سوداگری

جواناں را بد آموز است ایں عصر
شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بدامانش مثالِ شعلہ پیچم
کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

نوجوانوں کے لئے یہ عصر بد آموز ہے
جو شبِ ابلیس ہے اُس کا یہ گویا روز ہے
اس کے دامن میں مثالِ شعلہ میں پیچاں رہا
کیونکہ اس کی آگ بھی بے نور ہے بے سوز ہے

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد
ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
ولیکن الاماں از عصرِ حاضر
کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

دستِ مسلم نے کیے ہیں فقر و سلطانی بہم
اُس کے دل میں ہو چکے ہیں باقی و فانی بہم
الاماں، اس دور کے مکر و فسوں سے الاماں
مل گئی ہے اس میں سلطانی و شیطانی بہم

چہ گویم رقصِ تو چوں است و چوں نیست
حشیش است ایں نشاطِ اندروں نیست
بہ تقلیدِ فرنگی پائے کوبی
بہ رگہائے تو آں طغیانِ خوں نیست

کون سی شے نے کیا رقصاں تجھے، میں کیا کہوں؟
بھنگ ہے یہ اور نہیں ہر گز نشاطِ اندروں
ہو رہا ہے تو بہ تقلیدِ فرنگی پائے کوب[1]
جسم میں ورنہ کہاں پہلا سا وہ طغیانِ خوں

١٤٣ برہمن

در صدِ فتنہ را بر خود کشادی
دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

تو نے در فتنوں کا اپنے آپ پر خود وا کیا
دو قدم چلنے نہ پایا تھا کہ دھم سے گر پڑا
برہمن نے تو سجایا بُت سے اپنے طاق کو
تو نے بھی قرآں لپیٹا طاق میں پھر جا دھرا

١ـ پائے کوب: رقصاں

برہمن را نگویم ہیچ کارہ
کند سنگِ گراں را پارہ پارہ
نباید جز بہ زورِ دست و بازو
خدائے را تراشیدن ز خارہ

کیوں برہمن کو کہوں میں ہیچ کارہ بت تراش
ہاتھ سے اُس کے ہوا سنگِ گراں بھی پاش پاش
کارِ ہمت ہے بنانا ایک پتھر سے خدا
آہنیں بازو ہی سے آتی ہے خارہ میں تراش

نگہ دارد برہمن کارِ خود را
نمی گوید بہ کس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر
بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

برہمن رکھتا ہے اپنی ہی نظر میں کارِ خود
غیر سے کہتا نہیں ہر گز کبھی اسرارِ خود
مجھ سے کہتا ہے سدا "اب چھوڑ دے تسبیح کو"
دوش پر ڈالے ہوئے لیکن ہے وہ زنّارِ خود

برہمن گفت برخیز از درِ غیر
ز یارانِ وطن ناید بجز خیر!
بیک مسجد دو ملّا می نگنجد
ز افسونِ بتاں گنجد بیک دیر

برہمن بولا کہ چھوڑو غیر کی بزمِ کہن
ہیں ہماری خیر کے طالب تو یارانِ وطن
ایک مسجد میں تو دو ملّا سما سکتے نہیں
سحرِ بُت سے دیر میں ساکن ہیں کتنے برہمن

۱۵ تعلیم

تب و تابے کہ باشد جاودانہ
سمند زندگی را تازیانہ
بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب
کتاب و مکتب افسون و فسانہ

تاب و تب دل میں ترے جب جاودانہ ہو گئی
اسپ ہستی کے لئے وہ تازیانہ ہو گئی
اپنے بیٹے کو سکھایہ سوزِ دل، مکتب کو چھوڑ
جس کی اب تعلیم افسون و فسانہ ہو گئی

ز علم چارہ سازے بے گدازے
بسے خوشتر نگاہ پاکبازے
نکوتر از نگاہِ پاکبازے
دلے از ہر دو عالم بے نیازے

علم چارہ ساز ہو انساں کا جب بے گداز
اُس سے بہتر ہے مسلماں کی نگاہ پاکباز
اور نگاہِ پاک میں سے ہے کہیں بہتر وہ دل
ہو غنا دنیا میں جس کا دو جہاں سے بے نیاز

بہ آں مومن خدا کارے ندارد
کہ در تن جانِ بیدارے ندارد
ازاں از مکتبِ یاراں گریزم
جوانے خود نگہدارے ندارد

ایسے مومن پر نہیں ہے رحمتِ حق کا گزر
روحِ زندہ کا نہیں ہے جسم میں جس کے گھر
اس بنا پر مکتبِ یاراں سے کرتا ہوں گریز
اس میں دیکھا ہی نہیں میں نے جوان خود نگر

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے
ز بینائے غلط بینے نکو تر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش
ز دانش مندِ بے دینے نکو تر

یاد رکھ میرا یہ نکتہ، ایک مرد کور چشم
ہے یقیناً ایک بینائے غلط بیں سے بلند
یاد رکھ میرا یہ نکتہ بھی کہ اک نادانِ نیک
ہے یقیناً ایک دانش مندِ بے دیں سے بلند

از ایں فکرِ فلک پیما چہ حاصل
کہ گردِ ثابت و سیارہ گردد
مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد
بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

اُس فلک پیما تخیل سے بھلا کیا فائدہ
روز و شب رقصاں جو گردِ ثابت و سیارہ[1] ہو
ابر کے ٹکڑے کی صورت لے اُڑے جس کو ہوا
اور فضا کی وسعتوں میں دم بدم آوارہ ہو

ادب پیرایۂ نادان و داناست
خوش آں کو از ادب خود را بیاراست
ندارم آں مسلماں زادہ را دوست
کہ در دانش فزود و در ادب کاست۔

ہے ادب ہی پیرہن ہر عاقل و بے عقل کا
خوب ہے جس نے ادب ہی سے لیا خود کو سجا
دوست میں رکھتا نہیں ایسے مسلماں زادے کو
جو بڑھا دانش میں اور اُنس و ادب گھٹ گیا

[1] ثابت ٹھہرے رہنے والے اجرام فلک۔ سیارہ چلتے رہنے والے اجرام فلک

ترا نومیدی از طفلاں روا نیست
چہ پروا گر دماغِ شاں رسا نیست
بگو اے شیخِ مکتب گر بدانی
کہ دل در سینۂ شاں ہست یا نیست

طفلکِ ناداں سے نومیدی نہیں ہرگز روا
کچھ نہیں پروا اگر ہے عقل اُس کی نارسا
ہے تجھے معلوم اگر اے شیخِ مکتب یہ بتا
دل بھی ہے سینے میں اُس کے یا کہ وہ کھویا گیا

بہ پورِ خویش دین و دانش آموز
کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدستِ او اگر دادی ہنر را
یدِ بیضا است اندر آستینش

تو سکھا اپنے پسر کو اے مسلماں عقل و دیں
تاکہ چمکے ماہ و انجم کی طرح اُس کا نگیں
ہاتھ میں اُس کے اگر دے تو کوئی عمدہ ہنر
ہے یدِ بیضا سے روشن اُس کی گویا آستیں

نوا از سینۂ مرغِ چمن برد
ز خونِ لالہ آں سوزِ کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی
کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن برد

کر دیا نغموں سے خالی سینۂ مرغِ چمن
اور خونِ لالہ سے چھینا ہے وہ سوزِ کہن
ایسے مکتب اور دانش پر تو کیا کرتا ہے ناز
جس نے روٹی تک نہ دی اور مار ڈالا تن میں من

خدایا وقتِ آں درویش خوش باد
کہ دلہا از دمش چوں غنچہ بکشاد
بہ طفلِ مکتبِ ما ایں دعا گفت
پئے نانے بہ بندِ کس میفتاد

وقف اُس درویش کا رکھ پُر مسرت اے خدا
جس کے دم سے قلب ہر کس مثلِ غنچہ کھل گیا
طفلِ مکتب کو دُعا دیتا ہے یہ مردِ فقیر
ہو نہ روٹی کے لئے محکوم یہ اغیار کا

کسے کو لا الٰہ را در گرہ بست
ز بندِ مکتب و ملا بروں جست
بآں دین و بہ آں دانش مپرداز
کہ از ما می برد چشم و دل و دست

لا الٰہ کے نور سے جس مرد کا دل شاد ہے
مکتب و مُلا کے قید و بند سے آزاد ہے
مذہب و دانش نہ کر اُس نوع کے ہرگز قبول
چشم و دست و قلب جن کے ہاتھ سے برباد ہے

چو می بینی کہ رہزن کارواں کُشت
چہ پرسی کاروانے را چساں کُشت
مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ از وے روحِ قومے میتواں کُشت

تو نے جب دیکھا کہ مارا رہزنوں نے کارواں
پوچھتا کیا ہے کہ کیسے، کس بلا پر اور کہاں
علم جو تو نے پڑھا ہے اُس سے مت بیخوف ہو
مار سکتے ہیں اُسی کے زہر سے قومِ جواں

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے — وہ جواں مسلم کہ تھا جو خوش گلِ و رنگیں کلاہ

نگاہِ او چو شیراں بے پناہے — اور نظر بھی اُس کی تھی مانند شیراں بے پناہ

بہ مکتب علم میشی را بیاموخت — جب سے سیکھا علمِ میشی مدرسے میں بیٹھ کر

میسر نایدش برگ گیاہے — اب نہیں اُس کو میسر ایک بھی برگ گیاہ

شتر را بچۂ او گفت در دشت ہ — ایک دن بچہ شتر کا اس سے بولا دشت میں

نمی بینم خدائے چار سو را — دیکھ پاتا ہی نہیں ہوں میں خدائے چار سو

پدر گفت اے پسر چوں پا بلغزد — باپ بولا پاؤں تیرا جب بھی پھسلے گا کہیں

شتر ہم خویش را بیند ہم اورا — خود کو بھی اللہ کو بھی ہر گھڑی دیکھے گا تو

۱۶ تلاشِ رزق

پریدن از سرِ بامے ببامے — اُڑتے رہنا اِس جہاں میں بام سے بالائے بام

نہ بخشد جرّہ بازاں را مقامے — باز کو دیتا نہیں ہرگز کوئی اعلیٰ مقام

زنخچیرے کہ جز مشتِ پرے نیست — وسعتِ افلاک میں اک مشتِ پَر کے صید سے

ہماں بہتر کہ میری در کنامے ہ — خوب تر ہے آشیاں ہی میں تجھے مرگِ دوام

ہ — حاشیہ صفحہ ۱۱۰ پر

نگر خود را بچشمِ محرمانہ — کر تو خود پر ایک چشمِ مجرمانہ سے نظر

نگاہِ ماست ما را تازیانہ — تازیانہ ہے نظر میری مرے ہی جسم پر

تلاشِ رزق ازاں دادند ما را — حق نے بخشا ہے مجھے جذبۂ تلاشِ رزق کا

کہ باشد پر کشودن را بہانہ — تا بہانہ ہو یہی بہرِ کشادِ بال و پر

۱۷ نہنگ با بچۂ خویش (مگرمچھ اپنے بچے سے)

نہنگے بچۂ خود را چہ خوش گفت — اپنے بچے سے لگا کہنے نہنگ تیز گام

بہ دینِ ما حرام آمد کرانہ — ہے کنارہ تو ہمارے دینِ آبا میں حرام

بہ موج آویز و از ساحل بپرہیز — موج سے جنگ آزما ہو اور رہ ساحل سے دور

ہمہ دریاست ما را آشیانہ — آشیانہ ہے ہمارا اے پسر دریا تمام

---

۵ (حاشیہ صفحہ ۱۰۹) اشارت: شتر را الخ تلمیح ہے عربی ضرب المثل کی طرف الجمل لا یعرف الحق الا عند المزلق - یعنی اونٹ خدا کو نہیں پہچانتا جب تک اس کا پاؤں نہ پھسلے -

۵ کنام: باز کا گھونسلا

تو در دریا نۂ او در بر تست
بہ طوفاں در فتادن جوہر تست
چو یک دم از تلاطم ہا بیاسود
ہمیں دریائے تو غارتگرِ تست

تُو نہیں دریا میں ہے دریا کا حامل بر[1] ترا
اور لڑنا دم بدم طوفاں سے ہے جوہر ترا
ایک لمحے کو تلاطم کا عمل گر چھوڑ دے
پھر تو بن جائے گا یہ دریا ہی غارت گر ترا

۱۸ خاتمہ

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بیباکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکانِ امت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

ساقی و صہبا کی باتوں سے مجھے ہی اجتناب
میں نے بیباکی سے کی ہی رمزِ الفت بے حجاب
جو بھی اُمت کے بزرگوں سے سُنا میں نے کہا
شوخیٔ رندانہ سے، جس کا نہیں کوئی جواب

بخود باز آو دامانِ دلے گیر
درونِ سینۂ خود منزلے گیر
بدہ ایں کشت را خونابۂ خویش
فشاندم دانہ من تو حاصلے گیر!

اپنی عظمت کو سمجھ دامانِ اہلِ دل پکڑ
چاہئے منزل تو اپنے سینے میں منزل پکڑ
کشتِ فطرت کو تو کر سیراب اپنے خون سے
میں نے تو دانے بکھیرے اور تو حاصل پکڑ

[1] بر: بمعنی سینہ

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست
طوافِ او طوافِ بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

جس کو کہتے ہو حرم ہے قبلۂ قلب و نظر
اور طواف اُس کا نہیں ہرگز طوافِ بام و در
درمیان کعبہ و اقبال ایسی رمز ہے
جس کی جبریلِ امیں کو بھی نہیں ابتک خبر

حضورِ عالمِ انسانی

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

جاوید نامہ

آدمیّت کے ہیں معنی آدمی کا احترام
آدمی کا اس لئے پہچان اے غافل مقام

حضورِ عالمِ انسانی

تمہید

۱

بیا ساقی بیار آں کہنہ مے را
جوانِ فرودیں کن پیرِ دے را
نوائے دہ کہ از فیضِ دمِ خویش
چو مشعل بر فروزم چوبِ نے را

آ بھی ساقی اور اپنے ساتھ لا وہ کہنہ مے
ہو جوانِ فرودیں[1] جس کے اثر سے پیرِ دے[2]
کر عطا سینے کو میرے وہ نوائے شعلہ ریز
مثلِ مشعل جل اُٹھے جس کی تپش سے چوبِ نے

○

یکے از حجرۂ خلوت بروں آئے
بہ بادِ صبح گاہی سینہ بکشائے
خروشِ ایں مقامِ رنگ و بو را
بقدرِ نالۂ مرغے بیفزائے

چھوڑ دے اب حجرۂ خلوت کو اور جلوت میں آ
اور کر بادِ سحر پر سینۂ ویراں کو وا
گلشنِ عالم میں غافل نغمہ زن ہو چار دن
اور بقدرِ نالۂ بلبل خروش اس کا بڑھا

---

[1] فرودیں: بہار، جوانِ فرودیں: ترو تازہ جوان۔ [2] دے: خزاں۔ پیرِ دے: پیرِ کہن سال۔ ناکارہ بڈھا۔

۲

زمانہ فتنہ ہا آورد و بگذشت
خساں را در بغل پرورد و بگذشت
دو صد بغداد را چنگیزیٔ او
چو گورِ تیرہ بختاں کرد و بگذشت

دہر نے فتنے کئے کافی بپا اور چل دیا
ناکسوں کی پرورش کرتا رہا اور چل دیا
اپنی چنگیزی سے صدہا بصرہ و بغداد کو
مثلِ گورِ تیرہ بختاں کر دیا اور چل دیا

بسا کس اندہ٥ِ فردا کشیدند
کہ دی مردند و فردا را ندیدند٥
خنک مرداں کہ در دامانِ امروز
ہزاراں تازہ تر ہنگامہ چیدند

لے گئے کتنے ہی انساں قلب میں فردا کا غم
حالِ فردا کو نہ دیکھا تھا کہ لی راہِ عدم
ہیں وہی مردانِ حق، جو دامنِ امروز میں
تازہ ہنگامے بپا کرتے رہے ہیں دم بدم

۳

چو بلبل نالۂ زارے نداری
کہ در تن جانِ بیدارے نداری
دریں گلشن کہ گل چینی حلال است
تو زخمے از سرِ خارے نداری

مثلِ بلبل تیرے ہونٹوں پر نہیں ہے آہِ زار
کیونکہ ہے نابود تن میں روحِ زندہ کا شرار
گلشنِ عالم میں کی فطرت نے گلچینی حلال
جسم پر تیرے مگر اک بھی نہیں ہے زخمِ خار

٥ مشکلات: اندہ، مخفف ہے اندوہ کا ٥ اشارات: بسا کس ... الخ، یہ شعر امیر خسروؒ کا ہے

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز
اپنے باطن ہی میں ہر دم پیچ کھانا سیکھ لے

بناخن سینہ کاویدن بیاموز
سینے کو ناخن سے لالہ گوں بنانا سیکھ لے

اگر خواہی خدا را فاش بینی
گر تمنا ہے کہ دیکھے تو خدا کو بے حجاب

خودی را فاش تر دیدن بیاموز
فاش تر کرنا خودی کو، خود کو پانا سیکھ لے

گلہ از سختیٔ ایام بگذار
کر نہ ہرگز شکوۂ جور و جفائے روزگار

کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است
جو حوادث کو نہ دیکھے ہے وہ خام و کم عیار

نمی دانی کہ آبِ جوئباراں
دیکھ اے غافل کبھی پتھر پہ آبِ جوئبار

اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است
اس کی رفتار اور منظر کس قدر ہے خوشگوار

کبوتر بچۂ خود را چہ خوش گفت
گنبدِ مسجد پہ اپنے بچے سے بولا حمام[1]

کہ نتواں زیست با خوئے حریری
نرم خوئی سے نہ کرنا اپنی ہستی کو تباہ

اگر دَیاہو، زنی از مستیٔ شوق
وردِ یاہو، عشق کی مستی میں گر کرتا رہا

کلہ را از سرِ شاہیں بگیری
چھین لے گا ایک دن تو باز کے سر سے کلاہ

[1] حمام: کبوتر

فتادی از مقامِ کبریائی
حضورِ دوں نہاداں چہرہ سائی
تو شاہینی ولیکن خویشتن را
نگیری تا بہ دامِ خود نیائی

تو مقامِ کبریا سے ایسی پستی میں گرا
ہر ذلیل و بدعمل کے سامنے جا کر جھکا
اصل میں شاہیں ہے تو، محفوظ رکھ اپنا جلال
گر بلندی چاہتا ہے، دام میں اپنے ہی آ

خوشا روزے کہ خود را بازگیری
ہمیں فقر است کو بخشد امیری
حیاتِ جاوداں اندر یقین است
رہ تخمین و ظن گیری، بمیری

وہ مبارک دن ہے جب ہو تو خودی کو گیر
ہے یہی وہ فقر کرتا ہے جو مفلس کو امیر
ہو یقین دل میں تو پا لے گا حیاتِ جاوداں
جب کرے گا شک تو دستِ موت میں ہوگا اسیر

تو ہم مثلِ من از خود در حجابی
خنک روزے کہ خود را بازیابی
مرا کافر کند اندیشۂ رزق
ترا کافر کند علمِ کتابی

ہے مری مانند ابھی تیری خودی زیر [illegible]
خوب ہے اب بھی اُلٹ دے گر تو [illegible]
مجھ کو کافر کر رہی ہے ہر گھڑی فکرِ معاش
کر گیا کافر تجھے لیکن فقط علمِ کتاب

چہ خوش گفت اشترے با کرۂ خویش
خنک آں کس کہ داند کارِ خود را
بگیر از ما کہن صحرا نورداں
بہ پشتِ خویش بردن بارِ خود را

اونٹ نے بچے سے اپنے کس قدر اچھا کہا
ہے مبارک جو کرے خود دہر میں ہر کارِ خود
ہم کہن صحرا نوردوں کی نصیحت یاد رکھ
پیٹھ پر اپنی ہی لے کر چل ہمیشہ بارِ خود

۴

مرا یاد است از دانائے افرنگ
بسا رازے کہ از بود و عدم گفت
ولیکن با تو گویم ایں دو حرفے
کہ با من پیر مردے از عجم گفت

یاد ہے مجھ کو کہ اکثر ایک دانائے فرنگ
کھولتا رہتا تھا مجھ پر عقدۂ بود و عدم
میں سناتا ہوں مگر اک نکتۂ حکمت تجھے
جو کہ مجھ سے کہہ گیا ہے پیرِ دانائے عجم

الا اے کشتۂ نامحرمے چند
خریدی از پئے یکدل غمے چند
ز تاویلاتِ ملایاں نکوتر
نشستن با خود آگاہے دمے چند

جاہلوں کے ہاتھ سے کرتا ہے تو خود پر ستم
پیروی سے نفس کی سہتا ہے دل پر جور و غم
مفتی و ملا کی تاویلات سے بہتر ہے یہ
مردِ خود آگاہ کی مجلس میں تو بیٹھے دو دم

۵

وجود است ایں کہ بینی یا نمود است
حکیمِ ما چہ مشکل ہا کشود است
کتابے بر فنِ غوّاص بنوشت
ولیکن در دلِ دریا نبود است

یہ ہے فطرت کی حقیقت یا نمودِ سرسری؟
فلسفی نے کون سے کھولے ہیں رازِ زندگی؟
لکھ تو دی ہے گو فنِ غوّاص پر اس نے کتاب
خود مگر اک بار بھی دریا میں غوّاصی نہ کی

بہ ضربِ تیشہ بشکن بیستوں را
کہ فرصت اندک و گردوں دو رنگ است
حکیماں را دریں اندیشہ بگذار
شرر از تیشہ خیزد یا ز سنگ است

ضربِ تیشہ سے تو کر دے بیستوں[1] کو پاش پاش
کیونکہ فرصت ہے تری تھوڑی، مگر گردوں دو رنگ
فلسفی کو غرق رہنے دے سدا اس بحث میں
ہے شرارِ جستہ کی بنیاد تیشہ یا کہ سنگ

منہ از کف چراغِ آرزو را
بدست آور مقامِ ہاؤ ہو را
مشو در چار سوئے ایں جہاں گم
بخود باز آ و بشکن چار سو را

ہاتھ میں ہرگز نہ رکھ غافل چراغِ آرزو
اور کر ہمت سے حاصل پھر مقامِ ہاؤ ہُو!
چار سوئے دہر میں ہستی نہ کر اپنی فنا
رہ خودی سے باوفا اور توڑ قیدِ چار سُو

[1] بیستوں: نام پہاڑ کا جس کو فرہاد نے عشقِ شیریں میں تراشا تھا۔

دلِ دریا سکوں بیگانہ از تست
بہ جیبش گوہرِ یکدانہ از تست
تو اے موجِ اضطرابِ خود نگہدار
کہ دریا را متاعِ خانہ از تست

تیری جنبش سے دلِ دریا سکوں بیگانہ ہے
جیب میں اُس کی تجھی سے گوہرِ یکدانہ ہے
ہو کبھی ضائع نہ تیرا اضطراب اے موج دیکھ
تیری بے تابی ہی دریا کی متاعِ خانہ ہے

دو گیتی را بہ خود باید کشیدن
نباید از حضورِ خود رمیدن
بہ نورِ دوش بیں امروزِ خود را
ز دوش امروز را نتواں ربودن

جذب کر لے اپنے سینے ہی میں تو ہر دو جہاں
ہو نہ لے ناداں اپنے حُسنِ باطن سے رواں
توڑنا مشکل ہے جب ماضی سے رشتہ حال کا
شوکتِ امروز نورِ دوش سے کر دے عیاں

بما اے لالہ خود را وا نمودی
نقاب از چہرۂ زیبا کشودی
ترا چوں بر دمیدی لالہ گفتند
بشاخ اندر چساں بودی چہ بودی

اے گُلِ لالہ کیا ہے مجھ پہ تو نے سینہ وا
اور عیاں میری نظر پر چہرۂ زیبا کیا
جب تو نکلا شاخ سے لالہ تجھے کہنے لگے
شاخ کے اندر تھا کیوں کر اور کیا؟ اتنا بتا

۶

نگرید مرد از رنج و غم و درد
زد دراں کم نشیند بر دلش گرد
قیاس او را مکن از گریۂ خویش
کہ ہست از سوز و مستی گریۂ مرد!

وجہ گریہ مرد کی ہرگز نہیں ہے رنج و درد
اور حوادث سے نہ اس کے قلب پہ بیٹھے گی گرد
اس کے رونے کو نہ کر تو اپنے رونے پر قیاس
سوز و مستی سے ہوا کرتا ہے گریاں شیر مرد

○

نہ پنداری کہ مرد امتحاں مُرد
نمیرد گرچہ زیر آسماں مُرد
ترا شایاں چنیں مرگ است ورنہ
زہر مرگے کہ خواہی می تواں مُرد

موت پا کر بھی نہیں مرتا ہے مرد امتحاں
جاوداں ہے، مر چکا ہے گو وہ زیر آسماں
ہے تری ہستی کے شایاں موت کی یہ رسم عام
ورنہ تو اک طرز اعلیٰ پر بھی دے سکتا ہے جان

○

اگر خاکِ تو از جاں محرمے نیست
بشاخِ تو ہم از نیساں نمے نیست
زغم آزاد شو، دم را نگہ دار
کہ اندر سینۂ پُردم غمے نیست

خاکِ تن تیری جو سوزِ جان کی محرم نہیں
ابر نیساں سے تری شاخوں میں بالکل نم نہیں
غم سے تو آزاد رہ کر تار دم پر رکھ نظر
کیونکہ جو سینہ ہو پُردم اس میں راہِ غم نہیں

پریشاں ہر دمِ ما از غمے چند
شریکِ ہر غمے نامحرمے چند
و لیکن طرحِ فردائے تواں ریخت
اگر دانی بہائے ایں دمے چند

ہیں غمِ باطن سے ہوں ہر لمحہ دنیا میں تپاں
اور نامحرم ہیں اس غم کے شریک و رازداں
تو بنائے قصرِ مستقبل کو کرلے استوار
گر یہ سمجھے ہے ترے دم کا بہا[1] کتنا گراں

جوانمردے کہ دل با خویشتن بست
رود در بحر و دریا ایمن از شست
نگہ را جلوہ مستی ہا حلال است
و لے باید نگہ داری دل و دست

جس نے اپنی ذات ہی سے دل لیا اپنا لگا
بحر و دریا میں بھی وہ بے خوف و بیخدشہ رہا
گو نظر پر جلوہ مستی کردی فطرت نے حلال
رہ محافظ پھر بھی ہر دم اپنے قلب و دست کا

ازاں غم ہا دلِ ما دردمند است
کہ اصلِ او ازیں خاکِ نژند است
من و تو زاں غمِ شیریں نہ دانیم
کہ اصلِ او ز افکارِ بلند است

قلب میرا ہے سدا ایسے ہی غم سے دردمند
جس کی ہے بنیاد اسی معمورہ کی خاکِ نژند[2]
اُس غمِ شیریں سے ہم بیتے ہیں لیکن بے خبر
جس کی اصلِ پاک ہے دنیا میں افکارِ بلند

[1] بہا: قیمت [2] نژند: خوار و خراب

مگو با من خدائے ما چنیں کرد
کہ شستن می‌تواں از دامنش گرد
تہ و بالا کن ایں عالم کہ در وے
قمارے می برد نامرد از مرد

کہہ نہ تو ہرگز، خدا نے مجھ کو بخشا رنج و درد
ہو جو ہمت جھاڑ سکتا ہے تو دل سے غم کی گرد
اس جہاں کو کر تہ و بالا کہ جس کے کھیل میں
جیتتا نامرد ہے اور ہار کھا جاتا ہے مرد

بروں کن کینہ را از سینۂ خویش
کہ دودِ خانہ از روزن بروں بہ
ز کشتِ دل مدہ کس را خراجے
مشو اے دہ خدا غارت گرِ دہ

اپنے سینے میں نہ رہنے دے تو کینے کا اثر
جب دھواں[1] بھر جائے گھر میں کھول دے سب بند در
کشتِ دل سے دے نہ تو ہرگز کسی کو بھی خراج
دہ خدا[2] یا! اپنے گاؤں کو تو خود ویراں نہ کر

سحر ہا در گریبانِ شبِ اوست
دو گیتی را فروغ از کوکبِ اوست
نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

صبح کی تخلیق اُس کی آستینِ شب سے ہے
اور فروغ ہر دو عالم بھی اُسی کوکب سے ہے
اس سے بہتر کیا بتاؤں مردِ مومن کا نشاں
وقتِ مُردن اک تبسم ظاہر اُس کے لب سے ہے

[1] یہاں کینے کو دھوئیں سے تشبیہ دی ہے   [2] دہ خدا: گاؤں کا مالک

۷

بباد صبح دم شبنم بنالید
کہ دارم از تو امیدِ نگاہے
دلم افسردہ شد از صحبتِ گل
چناں بگذر کہ ریزم برگیاہے

اوس باد صبح سے کہنے لگی با اشک و آہ
رحم کر، میں تجھ سے ہی رکھتی ہوں امیدِ نگاہ
صحبت گل سے تو میرا دل فسردہ ہو چکا
اس طرح چل اب کہ لے آغوش میں مجھکو گیاہ

۸ دل

دل آں بحر است کو ساحل نورزد
نہنگ از ہیبتِ موجش بلرزد
ازاں سیلے کہ صد ہاموں بگیرد
فلک بایک حبابِ او نیرزد

دِل وہ قلزم ہے کہ ساحل سے ہے جسکو اجتناب
خوف سے اسکے نہنگوں کا ہے زہرہ آب آب
دشت صدہا ڈوبتے ہیں قلب کی جس سیل میں
ہے فلک بھی اُس کی پہنائی میں گویا اک حباب

دلِ ما آتش و تن موجِ دودش
تپیدِ دم بدم سازِ وجودش
بذکرِ نیم شب جمعیتِ او
چو سیمابے کہ بندد چوبِ عودش

قلب میرا آگ ہے اور جسم گویا موجِ دود
دم بدم سوز و تپش اس دل کا ہے سازِ وجود
اس کے اطمینان کا باعث ہے ذکر نیم شب
جس طرح پارے کی تسکیں کا سبب ہے چوبِ عود

زمانہ کارِ او را می برد پیش
کہ مردِ خود نگہدار است درویش
ہمیں فقر است و سلطانی کہ دل را
نگہ داری چو دریا گوہرِ خویش

وقت کرتا ہے عطا اُس کو ترقی بیش بیش
کیونکہ مردِ خود نگر فطرت میں ہے درویش کیش
فقر میں شاہی جو چاہے دل پہ رکھ ہر دم نظر
جس طرح ہیں بحر کے قبضے میں گوہر ہائے خویش

نہ نیروئے خودی را آزمودے
نہ بند از دست و پائے خود کشودے
خرد زنجیر بودے آدمی را
اگر در سینۂ او دل نبودے

وہ نہ کر سکتا حوادث سے خودی کا امتحاں
اور نہ بندِ شر سے ہو سکتے رہا قلب و زباں
عقل اک زنجیر ہوتی آدمی کے واسطے
قلبِ زندہ اُس کے سینے میں نہ گر ہوتا نہاں

تو می گوئی کہ دل از خاک و خون است
گرفتارِ طلسمِ کاف و نون است
دلِ ما گرچہ اندر سینۂ ماست
و لیکن از جہانِ ما برون است

تو یہ کہتا ہے کہ ہے بنیادِ دل کی خاک و خوں
اور یہ ہے ہر دم گرفتارِ طلسمِ کاف و نون [1]
قلب میرا اگرچہ ہے آباد سینے میں مرے
لیکن اس پر بھی جہانِ آب و گِل سے ہے بروں

[1] کاف و نون: کُن یعنی ہو جا۔ مراد عالمِ کون و فساد جو خدا حکم "کُن" سے پیدا ہوا۔

جہانِ مہر و مہ زنّاریِ اوست
کشادِ ہر گرہ از زاریِ اوست
پیامے دہ زمن ہندوستاں را
غلام آزاد از بیداریِ اوست

حل ہر اک عقدے کا اس جا قلب کی زاری سے ہے
اور فروغِ مہر و مہ بھی دل کی زنّاری[1] سے ہے
دو مرا پیغام جا کر اہلِ ہندستان کو
گر غلام آزاد ہے تو دل کی بیداری سے ہے

من و تو کشتِ یزداں حاصل است ایں
عروسِ زندگی را محمل است ایں
غبارِ راہ شد دانائے اسرار
نہ پنداری کہ عقل است ایں دل است ایں

ہم سبھی ہیں کشتِ یزداں، کشت کا حاصل ہے دل
اور عروسِ زندگی کے واسطے محمل ہے دل
اس کی صحبت سے غبارِ راہ ہے دانائے راز
عقل بیچاری کی یہ قسمت کہاں، یہ دل ہے دل

گہے جویندۂ حسنِ غریبے
خطیبے منبرِ او از صلیبے
گہے سلطانِ با خیل و سپاہے
ولے از دولتِ خود بے نصیبے

گاہ میرا قلب ہے جویندۂ حسنِ غریب
گہ خطیبِ خوش نوا ہے جس کا منبر ہے صلیب
اور کبھی یہ دل ہے اک سلطان با خیل[2] و سپاہ
جو مگر رہتا ہے خود دولت سے اپنی بے نصیب

۱ زنّاری: بمعنی پابندی و اسیری ۲ خیل: لشکر

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست
درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست
دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

دل کی دنیا کو نہ سمجھو اک جہانِ رنگ و بو
اس میں پاؤ گے نہ تم پست و بلند و کاخ و کو
دل کے عالم میں نہیں چرخ و زمیں و چار سو
اس میں کوئی چیز ہے بھی تو فقط اللہ ہو

نگہ دید و خرد پیمانہ آورد
کہ پیماید جہانِ چار سو را
مے آشامے کہ دل گویند نامش
بخویش اندر کشید ایں رنگ و بو را

عقل نے پیدا کئے پیمانہ ہائے آرزو
تا کہ ناپے اُس سے پہنائے جہانِ چار سُو
رندِ مے آشام نے، جس کو کہا کرتے ہیں دل
اپنی تہہ میں غرق کر ڈالا جہانِ رنگ و بو

محبت چیست؟ تاثیرِ نگاہیست
چہ شیریں زخمے از تیرِ نگاہیست
بصیدِ دل روی؟ ترکش بینداز
کہ ایں نخچیر نخچیرِ نگاہیست

کس کو کہتے ہیں محبت؟ ہے یہ تاثیرِ نگاہ
زخمِ شیریں دل کو کرتا ہے عطا تیرِ نگاہ
صیدِ دل کے واسطے جاتا ہے؟ ترکش پھینک دے
کیونکہ یہ نخچیر[1] ہے دراصل نخچیرِ نگاہ

۱؎ نخچیر: شکار

۹ خودی

خودی روشن ز نورِ کبریائی است
رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از مقاماتِ وصالش
وصالش از مقاماتِ جدائی است

منبعِ نورِ خودی ہے نورِ ذاتِ کبریا
وہ رسا ہوتی ہے جب ہو عشق اُس کا نارسا
ہجر کو اُس کے جنم دیتا ہے خود ذوقِ وصال
وصل پا لیتی ہے جب دلبر سے رہ جائے جدا

○

چو قومے درگذشت از گفتگو ہا
ز خاکِ او بروید آرزو ہا
خودی از آرزو شمشیر گردد
دمِ او رنگ ہا بُرّد ز بو ہا

چھوڑ کر جب گفتگو ہو قوم گرمِ جستجو
خاکِ تن سے اُس کی اُگتا ہے نہالِ آرزو
آرزو ہی سے خودی تیری ہے وہ تیغِ اصیل
دھار جس کی کاٹ دے اک دم میں گل سے رنگ و بو

○

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے
نمیدانم کہ ایں تابندہ گوہر
کجا بودے اگر دریا نبودے

ہے وجودِ حق ہی سے ثابت خودی کا بھی وجود
اور نمودِ حق سے ہوتی ہے خودی کی بھی نمود
سینۂ انسان میں ہے روشن خودی کا جو گہر
کس جگہ رہتا وہ گہر، دریا کی گر ہوتی نہ بود[1]

[1] بود: یعنی ہستی

دلے چوں صحبتِ گل می پذیرد
ہماندم لذتِ خوابش بگیرد
شود بیدار چوں من آفریند
چو من محکومِ تن گردد بمیرد

قلبِ مومن صحبتِ گل کا کرے جب التزام
اک جمود و خواب طاری اُس پہ رہتا ہی مدام
حاکمِ تن ہے جو ”من“ تو قلب بھی بیدار ہے
”من“ ہوا محکومِ تن تو چھا گئی مرگِ دوام

وصالِ ما وصال اندر فراق است
کشودِ ایں گرہ غیر از نظر نیست
گہر گم گشتۂ آغوشِ دریا است
ولیکن آبِ بحر آبِ گہر نیست

وصل بھی ہے وصل جب وہ ہجر سے ہو بہرہ ور
یہ وہ عقدہ ہے جسے کرتا ہے حل سوزِ نظر
گرچہ گوہر ہو چکا آغوشِ دریا ہی میں گم
آبِ دریا کو مگر کہتے نہیں آبِ گہر

کفِ خاکے کہ دارم از درِ اوست
گل و ریحانم از ابرِ ترِ اوست
نہ ”من“ را می شناسم من نہ ”او“ را
ولے دانم کہ ”من“ اندر برِ اوست

خاکِ تن مجھ کو ملی ہے قلب کی درگاہ سے
اور اسی کے ابرِ تر سے میرے گل پیدا ہوئے
میں ”من“ و ”او“ کو نہیں پہچانتا لیکن یہ ”من“
ہے ترا ”من“ بھی نہاں اندر اُسی آغوش کے

۱۰. جبر و اختیار

یقین دانم کہ روزے حضرتِ او | بالیقیں زندہ کرے گا ایک دِن سب کو خدا
ترازوئے نہد ایں کاخ و کو را | اور قیامت میں لگائے گا ترازو عدل کا
ازاں ترسم کہ فردائے قیامت | ہے مگر یہ ڈر مجھے، ہوگی نہ ہرگز سازگار
نہ مارا سازگار آید نہ اورا | مجھ کو اور خالق کو میرے پرسشِ روزِ جزا[1]

بہ روما گفت با من راہبِ پیر | ایک راہب نے کہا روما میں شفقت سے مجھے
کہ دارم نکتۂ از من فرا گیر | نکتۂ روشن مرا سُن اور گرہ میں باندھ لے
کند ہر قوم پیدا مرگِ خود را | دہر میں ہر قوم اپنی موت کا باعث ہے خود
ترا تقدیر و مارا کشت تدبیرا | مرگئی تقدیر سے کوئی، کوئی تدبیر سے

۱۱ موت

شنیدم مرگ با یزداں چنیں گفت | ایک دن بولی خدا سے موت ہو کر سوگوار
چہ بے نم چشمِ آں کز گل بزاید | تُو رُو نم سے ہے تہی انساں کی چشمِ بے وفا
چو جانِ او بگیرم شرمسارم | مجھ کو اِس صیدِ زبوں کی جان لینا بھی ہے عار
ولے او را ز مُردن عار ناید | موت کے حملے سے لیکن وہ نہیں ہے شرمسار

۱؎ مفہوم و منشاء بالکل یہ ہے کہ :-
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل | آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

ثباتش دہ کہ میرِ شش جہات است	دے ثبات انساں کو، وہ ہے امیرِ شش جہات
بدستِ او زمامِ کائنات است	اور اسی نے تھام رکھی ہے زمامِ کائنات
نگمردد شہسوار از خواریٔ مرگ	موت کی خواری سے ہوتا ہی نہیں وہ شہسوار
کہ نامحرم ز ناموسِ حیات است	کیونکہ اُس کی چشم سے مخفی ہے ناموسِ حیات

۱۲ بگو ابلیس را

بگو ابلیس را از من پیامے	کوئی دے اقبالؔ کا ابلیس کو جا کر پیام
تپیدن تا کجا در زیرِ دامے	کب تلک تڑپا کرے گا دہر میں تو زیرِ دام
مرا ایں خاکداں خوش نیاید	خوش نہ آیا مجھ کو تو اللہ کا یہ خاکداں
کہ صبحش نیست جز تمہیدِ شامے	ہر سحر جس کی ہوا کرتی ہے اک تمہیدِ شام

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند	جب کہ دنیا نے نہیں پہنا تھا جامہ زیست کا
ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند	اُس کا دل قعرِ عدم میں سرد و بے ہنگامہ تھا
بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود	سوز تھا کس چیز میں اُس جا مری جاں کے بغیر؟
ترا از آتشِ ما آفریدند	تجھ کو بھی حق نے مری ہی آگ سے پیدا کیا

جدائی شوق را روشن بصر کرد
جدائی شوق را جوینده‌تر کرد
نمیدانم که احوالِ تو چون است
مرا این آب و گِل از من خبر کرد

عشق کو حق نے جدائی سے کیا روشن بصر
اور جدائی ہی سے میرا شوق ہے جوئندہ تر
تو ہی جانے ہجر سے اب ہے ترا احوال کیا
مجھ کو آب و گِل نے مجھ سے کر دیا ہے باخبر

ترا از آستانِ خود براندند
رجیم و کافر و طاغوت خواندند
من از صبحِ ازل در پیچ و تابم
ازان خارے که اندر دل نشاندند

حق نے تجھ کو اپنے در سے تا ابد بے حق کیا
اور رجیم و کافر و طاغوت بھی تجھ کو کہا
دل میں میرے رکھ دیا تھا اُس نے جو خارِ فراق
ہے خلش اُس کی مجھے سرچشمہ سوز و ساز کا

تو می دانی صواب و ناصوابم
نروید دانه از کشتِ خرابم
نکردی سجده و از دردمندی
بخود گیری گناهِ بیحسابم

جانتا ہے خوب تو میرے صواب و ناصواب
دانہ نیکی کا نہیں دیتی مری کشتِ خراب
منکرِ سجدہ ہوا تو، دردمندی سے مگر
اپنے سر لیتا ہے اب میرے گناہِ بیحساب

بیا تا نرد را شاہانہ بازیم
جہانِ چار سو را در گدازیم
بافسونِ ہنر از برگِ کاہش
بہشتے ایں سوئے گردوں بسازیم

آ کہ کھیلیں نرد شاہی شان سے ہم اور تو
موم کر دیں سوز سے اپنے جہانِ چار سو
حسبِ اعجازِ ہنر اک دم میں برگِ کاہ سے
چرخ کے نیچے بنائیں اک جہانِ رنگ و بو

١٣ ابلیسِ خاکی و ابلیسِ ناری

فسادِ عصرِ حاضر آشکار است
سپہر از زشتیِ او شرمسار است
اگر پیدا کنی ذوقِ نگاہے
دو صد شیطاں ترا خدمتگزار است

ہے فسادِ عصرِ حاضر ہر بشر پر آشکار
زشتی و پستی سے اس کی چرخ بھی ہے شرمسار
بہرِ حق پیدا کرے گر آج بھی ذوقِ نگاہ
سینکڑوں شیطان بن جائیں ترے خدمتگزار

بہ ہر کو رہزنانِ چشم و گوش اند
کہ در تاراجِ دلہا سخت کوش اند
گراں قیمت گناہے با پشیزے
کہ ایں سوداگراں ارزاں فروش اند

ہر قدم پر اس جہاں میں رہزنانِ چشم و گوش
جو دلوں کو لوٹنے میں ہیں نہایت سخت کوش
کوڑیوں میں دے رہے ہیں وہ گراں قیمت گناہ
کیونکہ یہ سوداگرانِ فسق ہیں ارزاں فروش

چه شیطانے خرامش واژگونے
کند چشم ترا کور از فسونے
من او را مردہ شیطانے شمارم
که گیرد چوں تو نخچیرِ زبونے

یہ ہے شیطان، چال بھی جس کی ہے دائم واژگوں[1]
تجھ کو اندھا کر رہا ہے اُس کا ہر مکر و فسوں
عندیے میں میرے وہ شیطان یکسر مردہ ہے
صید جو کرتا ہے آکر تجھ سا نخچیر[2] زبوں

چه زہرابے که در پیمانۂ اوست
کشد جاں را و تن بیگانۂ اوست
تو بینی حلقۂ دامے که پیداست
نہ آں دامے که اندر دانۂ اوست

کس بلا کے زہر سے اُس کا بھرا پیمانہ ہے
زہر جاں مہلک ہے، تن اُس سے مگر بیگانہ ہے
تو نے بیشک دیکھ ڈالا حلقہ اُس کے دام کا
دام وہ دیکھا نہیں لیکن جو زیرِ دانہ ہے

بشر تا از مقامِ خود فتاد است
بقدرِ محکمی او را گشاد است
گنہ ہم می شود بے لذتے سرد
اگر ابلیس تو خاکی نہاد است

جب سے پیدا ہو گیا انساں کی فطرت میں فساد
حسبِ ظرف و قوت اُس نے دہر میں پائی کُشاد
پھر گناہوں میں بھی لذت اور تپش ہو گی کہاں
جب گنہگاروں کا ہو ابلیس ہی خاکی نہاد

[1] واژگوں، الٹی، ٹیڑھی [2] نخچیر زبوں: لاغر شکار

مشو نخچیرِ ابلیسانِ ایں عصر
خساں را غمزۂ شاں سازگار است
اصیلاں را ہماں ابلیس خوشتر
کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است

عصرِ حاضر کے شیاطین کا نہ ہو ہرگز شکار
پست لوگوں کے لئے ہے اُنکا غمزہ سازگار
ہے وہی شیطاں خوشتر بہرِ مردانِ اصیل
جو ہے پہلے دن سے یزداں دیدہ و کامل عیار[1]

حریفِ ضربِ او مردِ تمام است
کہ آں آتش نسب والا مقام است
نہ ہر خاکی سزاوارِ نخِ اوست
کہ صیدِ لاغرے بر وے حرام است

ہے حریفِ ضرب اُس کا دہر میں مردِ تمام
کیونکہ وہ آتش نسب ہے محکم و والا مقام
ہر کس و ناکس کو وہ کرتا نہیں اُٹھ کر شکار
صیدِ لاغر کو سمجھتا ہے وہ اپنے پر حرام

ز فہمِ دوں نہاداں گرچہ دور است
ولے ایں نکتہ را گفتن ضرور است
بہ ایں نوزادہ ابلیساں نسازد
گنہگارے کہ طبعِ او غیور است

دُوں نہادوں کی سمجھ سے گرچہ یہ نکتہ ہے دور
اہلِ دانش کے لئے کہنا بھی ہے اسکا ضرور
عصرِ حاضر کے شیاطین سے کرے گا اجتناب
ہر وہ عاصی، دی ہے جس کو حق نے اِک طبعِ غیور

[1] کامل عیار: کھرا، اصلی۔

بہ یاران طریق

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

آ، تن اُمّت میں لائیں پھر عمل کا سوز و ساز
ہو قمارِ زیست میں جراءت ہماری وجہ ناز
نالہ کش اس درد سے ہوں شہر کی مسجد میں ہم
جس سے دلِ مُلّا کے سینے میں بھی ہو جائے گداز

بہ یارانِ طریق

۱

قلندر جرّہ بازِ آسمانہا
بہ بالِ او سبک گردد گرانہا
فضائے نیلگوں نخچیر گاہش
نمی گردد بگردِ آشیانہا

تو قلندر کو سمجھ اک جرّہ بازِ آسماں
اُس کے بال و پر پہ ہلکا ہے اِک بارِ گراں
وسعتِ افلاک ہے اُس باز کی نخچیر گاہ
وہ نہیں اُڑتا کبھی پستی میں گردِ آشیاں

زجانم نغمۂ اللہ ہو ریخت
چو گرد از رختِ ہستی چار سو ریخت
بگیر از دستِ من سازے کہ تارش
زسوزِ زخمہ چوں اشکم فرو ریخت

روح سے اُٹھتا ہے میری نغمہ اللہ ھُو
جھڑ رہا ہے رختِ ہستی سے غبار چار سُو
ساز میرے ہاتھ سے لے، کیونکہ اس کا تار تار
سوزِ زخمہ سے گِرا ہے مثلِ اشکِ آرزو

چو اشک اندر دلِ فطرت تپیدم
تپیدم تا بچشمِ او رسیدم
درخشِ من زمژگانش تواں دید
کہ من بر برگِ کاہے کم چکیدم

میں دلِ فطرت میں مثلِ اشک مضطر ہی رہا
اس تپش نے چشم تک اُس کی مجھے پہنچا دیا
ہے تجلّی ہی مری مژگانِ فطرت کا فروغ
بھول کر بھی میں نہ برگِ کاہ پر جا کے گرا

مرا از منطق آید بوئے خامی
دلیلِ او دلیلِ ناتمامی
برویم بستہ درہا را کشاید
دو بیت از پیرِ رومی یا ز جامی

آ رہی ہے مطبخِ منطق سے مجھ کو بوئے خام
جو دلیل اُس نے سُنائی، تھی دلیلِ ناتمام
کھولتے ہیں مجھ پہ اسرارِ ازل کے بند در
شعرِ پیرِ روم[1] یا گفتارِ مولانائے جام[2]

بیا از من بگیر آں دیر سالہ
کہ بخشد روح با خاکِ پیالہ
اگر آبش دہی از شیشۂ من
قدِ آدم بروید شاخِ لالہ

آ مری محفل میں اور لے وہ شرابِ کہنہ سال
رُوحِ روشن جس سے پا لیتا ہی اک جامِ سفال
میرے شیشے سے جو اُس کی آبیاری تو نے کی
شاخِ لالہ بھی اُگے گی قدِ آدم کی مثال

[1] مولانا جلال الدین رومی [2] مولانا عبدالرحمٰن جامی

بدستِ من ہماں دیرینہ چنگ است
درونش نالہ ہائے رنگ رنگ است
ولے بنوازمش با ناخنِ شیر
کہ او را تار از رگ ہائے سنگ است

آج کل ہے ہاتھ میں میرے وہی دیرینہ چنگ
جس کے پردوں میں ہیں پنہاں نالہ ہائے رنگ رنگ
شیر کے ناخن سے لیکن میں بجاتا ہوں اسے
تار ہیں اس ساز کے سب صورتِ رگہائے سنگ

بگو از من بہ پرویزانِ ایں عصر
نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ در دست
ز خارے کو خلد در سینۂ من
دلِ صد بیستوں را می توان خست

وقت کے پرویز جتنے ہیں انہیں جا کر کہو
جب نہیں میں کوہکن کیوں ہاتھ میں تیشہ رکھوں
جو کہ سینے میں کھٹکتا ہے مرے اُس خار سے
چیر سکتا ہوں میں لمحے میں دلِ صد بیستوں ۱؎

فقیرم ساز و سامانم نگاہیست
بچشمم کوہِ یاراں برگِ کاہیست
زمن گیر ایں کہ زاغِ دخمہ ؎ بہتر
ازاں بازے کہ دست آموزِ شاہیست

ہے فقیری ساز میرا اور ساماں ہے نگاہ
کوہِ یاراں بھی ہے میری چشم میں اک برگِ کاہ
زاغِ مرگھٹ کا بھی بہتر ہے ہزاروں مرتبہ
ایسے شاہیں سے رہا ہو جو کہ دست آموزِ شاہ ۲؎

۱؎ نام ہے پہاڑ کا جسے فرہاد نے چیرا تھا۔
؎ اشارات: دخمہ، پارسیوں کا مرگھٹ ۲؎ دستِ آموزِ شاہ: بادشاہ کے ہاتھ کا سدھایا ہوا

در دل را بروئے کس نہ بستم
نہ از خویشاں نہ از یاراں گسستم
نشیمن ساختم در سینۂ خویش
تہ ایں چرخِ گرداں خوش نشستم

واسطے سب کے کھلا رہتا ہے میرے دل کا باب
بے سبب کرتا نہیں ہوں میں کسی سے اجتناب
سینے میں اپنے بنایا میں نے اپنا آشیاں
اور زیرِ چرخ کاٹی عمر بے رنج و عتاب

دریں گلشن ندارم آب و جاہے
نصیبم نے قبائے نے کلاہے
مرا گلچیں بدآموزِ چمن خواند
کہ دادم چشمِ نرگس را نگاہے

گلشنِ عالم میں میں رکھتا نہیں کچھ آب و جاہ
اور مری قسمت میں آئی نے قبا اور نے کلاہ
نزدِ گلچیں ہے "بدآموزِ چمن" میرا خطاب
کیونکہ میں نے ہی عطا کی چشمِ نرگس کو نگاہ

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگِ سمن گفت
ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت

سینکڑوں دانا جہاں میں کہہ گئے اکثر سخن
ہیچ تھا ان کے سخن کے سامنے برگِ سمن
تو ہی کہہ انصاف سے ہے کون ایسا دیدہ ور
دیکھ کر کانٹے کو جو بتلا گیا حالِ چمن

ندانم نکتہ ہائے علم و فن را
مقامے دیگرے دادم سخن را
میانِ کارواں سوز و سرورم
سبک پے کرد پیرانِ کہن را

جانتا کچھ بھی نہیں میں نکتہ ہائے علم و فن
ہاں مری گفتار سے کچھ اور ہے شانِ سخن
کارواں میں ہے مرے ہی شعر کا یہ سوز و ساز
تیز تر جس سے ہوئی رفتارِ پیرانِ کہن

نہ پنداری کہ مرغِ صبح خوانم
بجز آہ و فغاں چیزے ندانم
مدہ از دست دامانم کہ یابی
کلیدِ باغ را در آشیانم

مت سمجھ مجھ کو کہ ہوں میں ایک مرغِ صبح خواں
جو نہیں کچھ جانتا دنیا میں جز آہ و فغاں
تھام لے دامن مرا اگر چاہتا ہے تو بہار
آشیاں میں میرے رکھی ہے کلیدِ گلستاں

بچشمِ من جہاں جز رہگذر نیست
ہزاراں رہرو و یک ہمسفر نیست
گذشتم از ہجومِ خویش و پیوند
کہ از خویشاں کسے بیگانہ تر نیست

کچھ نہیں میری نظر میں یہ جہاں جز رہ گذر
ہیں ہزاروں راہرو، لیکن نہیں اک ہم سفر
ہے ہجومِ اقربا سے مجھ کو ہر لمحہ گریز
خویش سمجھا تھا جنہیں ہیں مجھ سے وہ بیگانہ تر

بایں نابود مندی بودن آموز
بہائے خویش را افزودن آموز
بیفت اندر محیطِ نغمۂ من
بطوفانم چو دُر آسودن آموز

گرچہ فانی ہے تری ہستی سمجھ رازِ بقا
اور بازارِ جہاں میں اپنی قیمت کو بڑھا
غوطہ زن ہو اے مسلماں میرے بحرِ نغمہ میں
آ، مثالِ دُر مرے طوفان میں آرام پا

کہن پروردۂ ایں خاک دانم
ولے از منزلِ خود دل گرانم
دمیدم گرچہ از فیضِ نمِ او
زمین را آسمانِ خود ندانم

پرورش کا میری گو مرکز رہا یہ خاک داں
ہوں مگر منزل کو پانے کیلئے میں دل گراں۱؎
فیض نم نے اس زمیں کے گو اُگایا ہے مجھے
اس زمیں کو کہہ نہیں سکتا میں اپنا آسماں

ندانی تا نہ باشی محرمِ مرد
کہ دلہا زندہ گردد از دمِ مرد
نگہدار د ز آہ و نالہ خود را
کہ خود دار است چوں گردد غمِ مرد

زندگی ہے تطلب کی مردانِ مومن ہی کا دم
کیونکہ ہے خودداں کا دل دنیا میں رشکِ جامِ جم
رکھتے ہیں محفوظ وہ غم کو بھی آہ و نالہ سے
صابر و خوددار ہے اُنکی طرح سے اُن کا غم

۱؎ دِل گراں : اداس ، بے چین

نگاہے آفریں جاں در بدن بیں
بشاخاں نادمیدہ یاسمن بیں
وگرنہ مثلِ تیرے در کمانے
ہدف را با نگاہِ تیرزن بیں

ہو نظر حاصل تو دیکھے صاف تو رُوحِ بدن
اور شاخوں میں بھی دیکھے نادمیدہ یاسمن
یہ اگر ممکن نہیں تو صورتِ تیرِ کماں
دیکھ تو اپنے ہدف کو با نگاہِ تیرزن

خرد بیگانۂ ذوقِ یقین است
قمارِ علم و حکمت بدنشین[۱] است
دو صد بوحامد و رازی نیرزد
بنادانے کہ چشمش راہ بین است

عقل بے تنویر ہے بیگانۂ ذوقِ یقین
اور قمارِ علم و حکمت ہے قمارِ بدنشین
سینکڑوں بوحامد و رازی ہیں پست و بیوقار
پیشِ ناداں، جس کو حق نے دی ہی چشمِ راہ بیں

قماش و نقرہ و لعل و گہر چیست؟
غلامِ خوش گل و زریں کمر چیست؟
چو یزداں از دو گیتی بے نیازند
دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست؟

ہیچ ہیں اُن کی نظر میں نقرہ و لعل و گہر
ہیچ ہیں قصر و غلامِ خوش گل و زرّیں کمر
مثلِ یزداں خود بھی ہیں وہ دو جہاں سے بے نیاز
پس یہی دُنیا میں ہے سرمایۂ اہلِ ہُنر!

۱؎ قمارِ بدنشین: وہ جوئے باز جو دیانتداری سے نہ کھیلے اور مکر و فریب سے کام لے۔ قمار، اس مصرع میں بمعنی قمار باز مستعمل ہوا ہے۔

خودی را نشئہ من عین ہوش است
ازاں میخانۂ من کم خروش است
مئے من گرچہ ناصاف است درکش
کہ ایں تہ جرعۂ خمہائے دوش است

ہے خودی کے واسطے مستی بھی میری عین ہوش
اس بنا پر ہے مرا مے خانہ دائم بے خروش
گرچہ ہے ناصاف میری مے تو اسکو پی بھی جا
کیونکہ یہ تلچھٹ بھی ہے تہ جرعۂ خم ہائے دوش[1]

ترا با خرقہ و عمامہ کارے
من از خود یافتم بوئے نگارے
ہمیں یک چوب نے سرمایۂ من
نہ چوبِ منبرے نے چوبِ دارے

خرقہ و عمامہ میں ہر دم رہا تو محو کار
اور پائی میں نے اپنے قلب سے بوئے نگار[2]
ہے یہی اک چوبِ نے سرمایۂ نغمہ مرا
چوب منبر سے غرض ہے اور نہ مقصد چوبدار

چو دیدم جوہر آئینۂ خویش
گرفتم خلوت اندر سینۂ خویش
ازیں دانشورانِ کور و بے ذوق
رمیدم با غمِ دیرینۂ خویش

جب سے دیکھا میں نے اپنے جوہرِ آئینہ کو
اپنی خلوت گاہ ٹھہرایا ہے اپنے سینہ کو
محفلِ دانشورانِ کور و مردہ روح سے
میں کنارہ کش ہوا لے کر غمِ دیرینہ کو!

۱؎ تہ جرعۂ خم ہائے دوش: گزشتہ رات کے خم کا باقیماندہ گھونٹ
۲؎ نگار: معشوق

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

باندھ کر بستر جہاں سے جب میں رخصت ہو گیا
ہر کوئی بولا کہ تھا اقبال میرا آشنا
اس قدر سمجھا نہ کوئی چھوڑ کر رسمِ نمود
وہ کہاں سے آیا، اُس نے کیا کہا، کس سے کہا

۲

اگر دانا دل و صافی ضمیر است
فقیرے با تہی دستی امیر است
بدوشِ منعمِ بے دین و دانش
قبائے نیست پالانِ حریر است

فضلِ حق سے ہو اگر دانا دل و صافی ضمیر
ہے فقیرِ بے نوا بھی رشکِ سلطان و امیر
منعمِ بیدین و بے عقل و خرد کے دوش پر
جامۂ اطلس نہیں ہے، بلکہ پالان حریر[1]

۳

سجودے آوری دارا و جم را
مکن اے بے خبر رسوا حرم را
مبر پیشِ فرنگی حاجتِ خویش
ز طاقِ دل فرو ریز ایں صنم را

سجدہ کرتا ہے تو غافل پیشِ ہر دارا و جم
ذلّت و نکبت سے تیری ہو گیا رسوا حرم
سامنے انگریز کے حاجت نہ کوئی پیش کر
اپنے طاقِ دل سے تو فوراً گرا دے یہ صنم

[1] حریر: ریشم

شنیدم بیتکے از مردِ پیرے
کہن فرزانۂ روشن ضمیرے
اگر خود را بناداری نگہ داشت
دو گیتی را بگیرد آں فقیرے

ایک بوڑھے نے سنایا مجھ کو شعرِ دلپذیر
تھا وہ دانا و حکیم و خوش دل و روشن ضمیر
جس نے ناداری میں رکھی اپنی خودداری کی شان
ہر دو عالم پر ہوا قابض یقیناً وہ فقیر

نہاں اندر دو حرفے سرِّ کار است
مقامِ عشق منبر نیست دار است
براہیماں ز نمرود آں نترسند
کہ عودِ خام را آتش عیار است

ہے دو حرفوں میں نہاں اہلِ عمل کا سرِّ کار
جائے موزوں عشق کی منبر نہیں ہے بلکہ دار
ڈر نہیں سکتا کبھی نمرود سے قلبِ خلیلؑ
دہر میں ہوتی ہے عودِ خام کا آتش عیار[1]

مجو لے لالہ از کس غمگساری
چو من خواہ از درونِ خویش یاری
بہر بادے کہ آید سینہ بکشائے
نگہ داراں کہن داغے کہ داری

ڈھونڈ مت اس باغ میں اے لالہ کوئی غمگسار
ہے مری مانند تیرا دل ہی تیرا یارِ غار
جو ہوا بھی آئے اُس پر اپنا سینہ کھول دے
لیکن اپنے داغِ کہنہ کو نہ کھونا زینہار

[1] عیار: کسوٹی۔ مراد امتحان

ز پیرے یاد دارم ایں دو اندرز
نباید جز بجانِ خویشتن زیست
گریز از پیشِ آں مردِ فرودست
کہ جانِ خود گرو کرد و بتن زیست

دو نصائح یاد ہیں اک پیرِ دانا کی مجھے
جان سے اپنی ہی کر ہستی کی روشن انجمن
کر تو ایسے مردِ دوں فطرت کی محفل سے گریز
جان کو گروی کرکے جو زندہ رہا با خاکِ تن

بساحل گفت موجِ بیقرارے
بفرعونے کنم خود را عیارے
گہے بر خویش می پیچم چو مارے
گہے رقصم بذوقِ انتظارے

ایک دن کہنے لگی ساحل سے موجِ بیقرار
میں کسی فرعون سے کرتی ہوں قوت کا عیار[1]
اپنی ہستی ہی میں پیچاں ہوں کبھی میں مثلِ مار
اور کبھی رکھتا ہے رقصاں مجھ کو ذوقِ انتظار

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است
جبینِ خود مزن جز بر درِ او
سرِ ایں را ہم بر چوبش دہ کہ آخر
حقے دارد بہ خر پالاں گرِ او

گر فرنگی ہی سے پایا تو نے یہ سب مال و زر
رکھ اسی کے آستانے پر ہمیشہ اپنا سر
بلکہ بہتر ہو کہ اُس کی چوب پر رکھدے سریں
خر پہ حق رکھتا ہے آخر کچھ نہ کچھ پالان گر!

[1] عیار یعنی امتحان

فرنگی را دلے زیرِ نگیں نیست
متاعِ او ہمہ ملک است، دیں نیست
خداوندے کہ در طوفِ حریمش
صد ابلیس است و یک روح الامیں نیست

ایک دل بھی تو نہیں انگریز کے زیرِ نگیں
مُلک ہے مقصود اُس کا، طاعتِ مذہب نہیں
ہے وہ اک ایسا خدا جس کے حرم کے طوف میں
سب کے سب شیطان ہیں، اک بھی نہیں روح الامیں

من و تو از دلِ دیں نا اُمیدیم
چو بوئے گل ز اصلِ خود رمیدیم
دلِ ما مرد و دیں از مردنش مرد
دو تا مرگے بیک سودا خریدیم

میں بھی اور تو بھی ہیں اب تو دین و دل سے نا اُمید
مثلِ بوئے گل ہوئے ہیں اصل ہی سے ناپدید
دل مرا اور اس کے مرجانے سے دیں بھی مرگیا
ایک سودے میں دو موتیں ہیں جو ہم نے لیں خرید

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را
نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بہ کامِ او نہ گردد
بکامِ خود بگرداند زمیں را

جو مسلماں بھی سمجھتا ہے جہاں میں رمزِ دیں
رکھ نہیں سکتا کبھی وہ پیشِ غیر اللہ جبیں
حسبِ منشا اُس کے گر چکر نہ کاٹے آسماں
اپنی منشا کے مطابق وہ چلاتا ہے زمیں!

دل بیگانہ خو زیں خاکداں نیست
شب و روزش ز دورِ آسماں نیست
تو خود وقتِ قیامِ خویش دریاب
نمازِ عشق و مستی را اذاں نیست

اس دل بیگانہ کا مسکن نہیں یہ خاکداں
اس کے روز و شب نہیں ممنونِ دورِ آسماں
خود ہی تو تجویز کر اپنے لیۓ وقتِ قیام
عشق و مستی کی نمازوں پر نہیں قیدِ اذاں

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست
یقیں بے صحبتِ روح الامیں نیست
گر از صدق و یقیں داری نصیبے
قدم بیباک نہ، کس در کمیں نیست

عشق حق حاصل نہیں ہوتا بلا صدق و یقیں
اور یقیں ملتا نہیں بے صحبتِ روح الامیں
گر یقیں و صدق سے بے بہرہ ور تیری جبیں
رکھ دلیری سے قدم، منزل میں کچھ خطرہ نہیں

مسلماں را ہمیں عرفان و ادراک
کہ در خود فاش بیند رمزِ لولاک٭
خدا اندر قیاسِ ما نہ گنجد
شناس آں را کہ گوید ما عرفناک٭

در لولاک[۱] اس پہ جب دنیا میں ہو جاۓ عیاں
پاۓ مسلم نور سے اُس کے حیاتِ جاوداں
گر نہیں سمجھا خدا کو، اُس کی عظمت ہی سمجھ
ما عرفنا[۲] کی حقیقت کو کیا جس نے بیاں

٭ اشارات: لولاک، تلمیح بحدیث لولاک لما خلقت الافلاک۔ ۱ ۲ صفحہ ۱۵۰ پر
٭ اشارات، ما عرفناک، تلمیح بحدیث ما عرفناک حق معرفتک۔

به افرنگی بتاں خود را سپردی
چه نامردانه در بتخانه مردی
خرد بیگانهٔ دل، سینه بے سوز
که از تاکِ نیاگاں مے نخوردی

نوبتِ افرنگ ہی کا بندہ ہو کر رہ گیا
اور صنم خانے میں نامردوں کی صورت جا مرا
اس بنا پر عقل و دل تیرے ہیں بے سوز و سرور
تاک[1] سے اپنے بزرگوں کے نہ جامِ مے پیا

نه ہر کس خود گر و ہم خود گداز است
نه ہر کس مستِ نازِ اندر نیاز است
قبائے لاالٰہ خونیں قبائے است
که بر بالائے نامرداں دراز است

ہر کس و ناکس نہیں ہے خود تراش و خود گداز
ہر کوئی ہوتا نہیں ہے مستِ نازِ اندر نیاز
خونِ مرداں سے قبائے لاالٰہ ہے لالہ رنگ
وہ تنِ نامرد پہ ہے غیر موزون و دراز

بسوزد مومن از سوزِ وجودش
کشودِ ہر چه بستند از کشودش
جلالِ کبریائی در قیامش
جمالِ بندگی اندر سجودش

سوزِ مومن کا ہے منبع حق ہی کا سوزِ وجود
اور کشودِ حق سے ہر عقدے کی ہوتی ہی کشود
ہے قیام اُس کا جلالِ کبریا سے پُر جلال
اور جمالِ زندگی کے ترجماں اُس کے سجود

[1] تاک: انگور کی بیل: بقیہ حاشیہ صد ۱۴۹ ۔ [2] "لولاک لما خلقت الافلاک" "اے نبی! میں تجھے پیدا نہ کرتا، تو کائنات کو بھی پیدا نہ کرتا" (حدیث قدسی)۔ [3] "ما عرفناک حق معرفتک" "الٰہی! ہم نے تجھے اُس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننا چاہیے تھا"۔

چہ پرسی از نمازِ عاشقانہ
رکوعش چوں سجودش محرمانہ
تب و تابِ یکے اللہ اکبر
نہ گنجد در نمازِ پنجگانہ

ہیں رکوع اس کے جو سجدوں کے کمل رازدار
پوچھ مت مجھ سے نمازِ عاشقانہ کا خمار
کس طرح اُن کو سمیٹے گی نمازِ پنج وقت
ہیں نہاں "اللہ اکبر" میں جو مستی کے شرار

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست
مسلماں لایموت از رکعتِ اوست
ندانند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز
قیامت ہا کہ در "قد قامت" اوست

اُس کی قرأت میں ہے مخفی دعوتِ ہر دو جہاں
بہرِ مسلم اُس کی رکعت ہے حیاتِ جاوداں
پا نہیں سکتا اُسے یہ کشتۂ عصرِ رواں
حرفِ "قد قامت" میں جیسا شورِ محشر ہے نہاں

۵

فرنگ آئینِ رزاقی بداند
بایں بخشد ازو وامی ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند
کہ یزداں اندراں حیراں بماند

ہے فرنگ آئینِ رزاقی سے پورا باخبر
ایک کو دیتا ہے روٹی دوسرے سے چھین کر
اس طرح روزی عطا کرتا ہے وہ شیطان کو
ایک حیرت جس سے چھا جاتی ہے خود رزاق کو

ہ اشارات: صلا، دعوت ہ اشارات: لایموت، زندہ جاوید

چہ حاجت طول دادن داستاں را
بجز نے گویم اسرارِ نہاں را
جہانِ خویش باسوداگراں داد
چہ داند لامکاں قدرِ مکاں را

کیا ضرورت ہے کہ لمبی کروں یہ داستاں
اک دو حرفوں میں بیاں کرتا ہوں اسرارِ نہاں
دیدیا سوداگروں کے ہاتھ میں اپنا جہاں
لامکاں والے کو کیا معلوم ہے قدرِ مکاں

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است
بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

ایک جنت بن چکی ہے بہرِ پاکانِ حرم
دوسری جنت بھی ہے اک بہرِ اربابِ ہمم
اک بہشتِ مفت بھی ہے لئے تن آساں مسلمو
مست و خوش اُس میں رہو اور مت کرو کچھ رنج و غم

٦

قلندر میلِ تقریرے ندارد
بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خونِ شبیرؑ ے ندارد

اُنس مومن کو نہیں ہوتا فقط تقریر سے
اُس کی مٹی بھی ہے زر اس نکتے کی اکسیر سے
کوئی بھی حاصل نہ دیگی تم کو وہ کشتِ خراب
آب خون پاتی نہیں جو گردنِ شبیرؑ سے

اُردو نظمیں

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

۱۹۳۶ء

ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ 'قوالی' سے کچھ کمتر نہیں 'علمِ کلام'
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟
'ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام!'

دوسرا مشیر

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر

تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلا مشیر

ہُوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر!
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

تیسرا مشیر

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیمِ بے تجلّی! وہ مسیحِ بے صلیب!
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھا مشیر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
"گاہ بالد چوں صنوبر گاہ نالد چوں رباب!"

تیسرا مشیر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بےحجاب

پانچواں مشیر

(ابلیس کو مخاطب کر کے)

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گِل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز

ابلۂ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرت آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف
تیری غیرت سے ابد تک سرنگوں و شرمسار
گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بُروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرخ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں ابتک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

۲

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

۳

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدّد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے!
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمّت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ ودو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دُنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردئ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا
اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!

تصویر و مصوّر

تصویر

کہا تصویر نے تصویر گر سے
نمائش ہے مری تیرے ہنر سے
ولیکن کس قدر نا منصفی ہے
کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے

مصوّر

گراں ہے چشمِ بینا دیدہ ور پر
جہاں بینی سے کیا گذری شرر پر
نظر درد و غم و سوز و تب و تاب
تو اے ناداں قناعت کر خبر پر

تصویر

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی
نظر، دل کی حیاتِ جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز
سزاوارِ حدیثِ لن ترانی

مصوّر

تو ہے میرے کمالاتِ ہنر سے
نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

عالمِ برزخ

مُردہ اپنی قبر سے

کیا شے ہے؟ کس امروز کا فردا ہے قیامت
اے میرے شبستانِ کہن! کیا ہے قیامت

قبر

اے مردۂ صد سالہ! تجھے کیا نہیں معلوم؟
ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت

مُردہ

جس موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت
اس موت کے پھندے میں گرفتار نہیں میں
ہر چند کہ ہوں مردۂ صد سالہ و لیکن
ظلمت کدۂ خاک سے بیزار نہیں میں
ہو روح پھر اک بار سوارِ بدنِ زار
ایسی ہے قیامت تو خریدار نہیں میں

صدائے غیب

نے نصیبِ مار و کژدم نے نصیبِ دام و دد
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگِ ابد
بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

قبر

(اپنے مردہ سے)

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر محکوم کی میت سے سو بار الحذر
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

صدائے غیب

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود
ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود
زلزلے سے کوہ و در اُڑتے ہیں مانندِ سحاب
زلزلے سے وادیوں میں تازہ چشموں کی نمود
ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام
ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

زمین

آہ یہ مرگِ دوام! آہ یہ رزمِ حیات!
ختم بھی ہوگی کبھی کشمکشِ کائنات!
عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات
عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات
خوار ہوا کس قدر آدمِ یزداں صفات
قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات
کیوں نہیں ہوتی سحر حضرتِ انساں کی رات

معزول شہنشاہ

ہو مبارک اس شہنشاہِ نکو فرجام کو
جس کی قربانی سے اسرارِ ملوکیت ہیں فاش
'شاہ' ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بُت
جس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش
ہے یہ مشکِ آیۂ اِنّی اُعِیذُکَ بِکَ ہم غلاموں کیلئے
ساحرِ انگلیس! مارا خواجۂ دیگر تراش

دوزخی کی مناجات

اس دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری
رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد
پوجا بھی ہے بے سود، نمازیں بھی ہیں بے سود
قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد
ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد

نیشنے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے
سیراب ہے پرویز، جگر تشنہ ہے فرہاد

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز
سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

مسعود مرحوم

یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسمانِ کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود

خیال جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود

مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بیدردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود!
دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است (سعدیؒ)
نہ مجھ سے پوچھ کہ عمرِ گریز پا کیا ہے
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے
ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور
مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا؟ کیا ہے؟
غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے
دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز؟
نہیں! تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے؟
جہاں کی روحِ رواں لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے
قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے

گناہگار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے؟

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم
طلسم ہا شکند آں دلے کہ ما داریم

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات

خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم
دو صد ہزار تجلی تلافیٔ مافات

مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات

حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاک داں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

آوازِ غیب

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک
مہر و مہ انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمیٔ افکار، نہ اندیشۂ بے باک
روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری

رباعیات

۱

مری شاخِ امل کا ہے ثمر کیا
تری تقدیر کی مجھ کو خبر کیا
کلی گُل کی ہے محتاجِ کشود آج
نسیمِ صبحِ فردا پر نظر کیا

فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے

دگرگوں عالمِ شام و سحر کر
جہانِ خشک و تر زیر و زبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

۲

غریبی میں ہوں محسودِ امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے
مسلماں کو سکھا دی سر بزیری

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلّی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

کہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد
کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد
بتوں کو میری لادینی مبارک
کہ ہے آج آتشِ اللہ ہو سرد

حدیثِ بندۂ مومن دل آویز
جگر پُر خوں، نفس روشن، نگہ تیز!
میسر ہو کسے دیدار اس کا
کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز

تمیز خار و گل سے آشکارا
نسیمِ صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

نہ کر ذکر فراق و آشنائی
کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نے گہر کا
دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا الہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے

کبھی دریا سے مثلِ موج اُبھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

ملّازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

۱

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادیٔ لولاب

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیٔ لولاب

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب
اے وادیٔ لولاب

ملّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب
اے وادیٔ لولاب

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے

اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب

۲

موت ہے اک سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام
شرعِ ملوکانہ میں جدّتِ احکام دیکھ
صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام
اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

۳

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیٔ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ

ہے کہاں روزِ مکافات ملے خدائے دیر گیر؟

۴

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چارسو و رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

۵

درّاج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں
حیرت میں ہے صیّاد یہ شاہیں ہے کہ درّاج
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم
مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

۶

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست،
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

۷

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری
شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری
چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبح گاہِ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری؟

۸

بجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر
دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقش بند
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

۹

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گل
نہ کام آیا ملا کو علمِ کتابی
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں
غزلخواں ہوا پیرکِ اندرابی
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے
کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی
سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو
نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی
نہیں زندگی سلسلہ روز و شب کا

نہیں زندگی مستی و نیم خوابی
حیات است در آتشِ خود طپیدن
خوش آں دم کہ ایں نکتہ را باز یابی
اگر ز آتشِ دل شرارے بگیری
تواں کرد زیرِ فلک آفتابی

۱۰

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

۱۱

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ
کوئی بتلائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ
یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ
طلسمِ بے خبری، کافری و دینداری
حدیث شیخ و برہمن فسون و افسانہ
نصیبِ خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانہ کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یکدانہ

۱۲

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویمِ فردا ہے باطل
گرے آسماں سے پُرانے ستارے
ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے

کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

۱۳

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی انکی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ اُمتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

۱۴

چو کافرانہ قمارِ حیات می بازی
کہ باز مانہ بسازی بخود نمی سازی
دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دلِ جنید و نگاہِ غزالی و رازی
بحکمِ مفتیِ اعظم کہ فطرتِ ازلیست
بدینِ صعوہ حرام است کارِ شہبازی
ہماں فقیہہِ ازل گفت جرّہ شاہیں را
بآسماں گروی با زمیں نہ پردازی
منم کہ توبہ نہ کردم زفاش گوئی ہا
زبیم ایں کہ بسلطاں کنند غمازی
بدست ما نہ سمرقند نے بخارا ایست
دعا بگو ز فقیراں بہ ترکِ شیرازی

۱۵

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ

وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ

کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا باندازِ محرمانہ

سکندری ہو قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی

انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا

زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بیکرانہ

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رلایا

کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

۱۶

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی

تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ

تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا

دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا

دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ
اُمید نہ رکھ دولتِ دُنیا سے وفا کی
رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ

۱۷

خود آگہی نے سکھلا دی ہے جس کو تن فراموشی
حرام آئی ہے اس مردِ مجاہد پر زرہ پوشی

۱۸

آں عزم بلند آور آں سوز جگر آور
شمشیر پدر خواہی بازوئے پدر آور

۱۹

غریب شہر ہوں میں سُن تو لے مری فریاد
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاع عزیز
جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھکو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد

"صدائے تیشہ کہ بر سنگ میخورد دگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است"

سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدرآباد دکن کے نام

یوم اقبال کے موقعہ پر توشہ خانۂ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے، ایکہزار روپے کا چیک بطور تواضع موصول ہونے پر

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

* "صدائے تیشہ الخ" یہ شعر مرزا مظہر جانجاناں علیہ الرحمۃ کے مشہور بیاض "خریطۂ جواہر" میں ہے۔

حسین احمد

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

حضرتِ انساں

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی

یہ دُنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشکِ خونیں سے
کیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی

فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے
غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی

اگر مقصودِ کُل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے؟